بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۲ مئی ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

بیس سال بعد

"کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا" ——— چھ لفظ کے اس جملہ کو آج ایک شخص چھ سکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے کولمبس کو ۲۰ پُرمشقت سال صرف کرنے پڑے۔

کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) ۱۴۵۱ میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۶ میں اسپین میں اس کی وفات ہوئی۔ امریکہ کی دریافت حقیقتہً یورپ کے لیے مشرق کا سمندری راستہ دریافت کرنے کی کوشش کا ایک ضمنی حاصل (by-product) تھی۔ کولمبس نے ۱۴۸۴ میں پرتگال کے شاہ جان دوم (John II) سے درخواست کی کہ وہ اس بحری سفر کے لیے اس کی مدد کرے۔ مگر شاہ پرتگال نے اس کو بے فائدہ سمجھ کر مدد کرنے سے ' کر دیا۔

اس کے بعد کولمبس نے کیسٹل (Castile) کی ملکہ ازبیلا (Isabella) سے مدد کی درخواست کی یہاں بھی اس کو مثبت جواب نہیں ملا۔ تاہم کولمبس نے اپنی کوشش جاری رکھی، یہاں تک کہ آٹھ سال کے بعد ملکہ نے اس کو کشتیاں اور ضروری سامان مہیا کر دیا۔

کولمبس نے تین کشتیوں کے ساتھ اپنا پہلا سفر ۳ اگست ۱۴۹۲ کو شروع کیا۔ تاہم اس سفر میں وہ امریکہ کے ساحل تک پہونچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہر قسم کی مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود کولمبس اپنی کوشش میں لگا رہا۔

آخر کار چوتھے سفر کے بعد ۱۵۰۴ میں وہ "نئی دنیا" کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا (10/691) کولمبس سے پہلے دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کولمبس کی دریافت نے (نئی اور پرانی) دونوں دنیاؤں کو ملا کر ایک کر دیا۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم دریافت تھی۔ مگر یہ دریافت صرف اس وقت ممکن ہو سکی جب کہ کولمبس اور اس کے ساتھی بے حوصلہ ہوئے بغیر ۲۰ سال تک اس جان جوکھم منصوبہ کی تکمیل میں لگے رہے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں ہر کامیابی "۲۰ سالہ" محنت مانگتی ہے۔ اس کے بغیر یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ایک سنت

تبلیغی جماعت کے افراد جب گشت پر نکلتے ہیں تو ان میں بولنے والا صرف ایک ہوتا ہے جس کو متکلم کہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ چپ رہیں اور صرف متکلم کو بولنے کا موقع دیں۔

بقیہ لوگوں کے چپ رہنے کا مطلب سادہ طور پر صرف چپ رہنا نہیں ہے۔ تبلیغ کا نظام انھیں بھی ایک اہم کام بتاتا ہے۔ وہ کام یہ کہ وہ متکلم اور سامع کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے رجوع ہو کر خاموش زبان میں کہیں کہ اے اللہ، تو متکلم کو توفیق دے کہ وہ صحیح بات اپنی زبان سے نکالے، اور سامع کو توفیق دے کہ وہ صحیح بات کو سن کر اسے قبول کرلے۔

یہ بظاہر معمولی سی بات ہے، مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ یہ ایک سنت کو زندہ کرنے کے ہم معنی ہے جو موجودہ زمانہ میں تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم کی ایجاد نے لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کر دیا کہ اصل کام لکھنا اور بولنا ہے۔ اب ہر آدمی کچھ نہ کچھ لکھ کر چھاپنے لگا، اور ہر آدمی نے لاؤڈ اسپیکر لگا کر بولنا شروع کر دیا۔ حتی کہ لکھنے اور بولنے کا یہ ذوق اتنا بڑھا کہ اس کے ہنگامہ میں اصل بات ہی گم ہو کر رہ گئی۔ بولنا سب کچھ بن گیا اور نہ بولنا کچھ بھی نہ رہا۔

اسلام نے جو طریقہ بتایا اور صحابہ کرام نے جس پر کامل طور پر عمل کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف بولنا ہی کام نہیں ہے بلکہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ جس آدمی کے لئے بولنے کا موقع نہ ہو اس کے لئے بھی ایک عظیم مشغولیت ہے۔ یہ کہ وہ دوسرے دینی خادموں کے حق میں نیک دعا کرے۔ اور عام انسانوں کے لئے یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہ سنت اگر مسلمانوں میں پوری طرح زندہ ہو جائے تو بیشتر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ مزید یہ کہ ملت کے اندر اب جو کام جاری ہے، وہ کام زیادہ موثر اور کارگر بن جائے۔ کیونکہ اس کے بعد انسانی کوشش کے ساتھ خدا کی نصرت بھی اس میں شامل ہو جائے گی۔

اگر آپ بولنا جانتے ہیں تو بولئے۔ لیکن اگر آپ بولنا نہ جانتے ہوں تب بھی آپ کے لئے ایک بہت بڑا کام ہے ــــ آپ بولنے والوں کے حق میں اور سننے والوں کے حق میں دعا کیجئے۔ یہ دوسرا عمل پہلے عمل سے کسی بھی درجہ میں کم نہیں۔

شیر بولے گا

انسان شیر کو مارتا ہے۔ وہ شیر کو کٹہرے میں بند کرتا ہے۔ انسان اپنے اس فعل کو جائز ثابت کرنے کے لیے کہتا ہے کہ شیر ایک وحشی جانور ہے۔ وہ ایک خوں خوار حیوان ہے۔ تاہم یہ یک طرفہ بیان ہے۔ اس معاملہ میں فریق ثانی (شیر) کا بیان اب تک سامنے نہ آسکا۔ کیوں کہ شیر اپنی ساری بہادری اور عظمت کے باوجود بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس صورت حال پر افریقہ کے عوام کے درمیان ایک مثل مشہور ہے۔ افریقہ شیروں کا ملک ہے۔ افریقی جنگلوں میں سب سے زیادہ شیر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیر سے متعلق مثلیں بھی ان کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک مثل یہ ہے کہ جب تک شیر نہ بولیں، اس وقت تک تاریخ صرف وہی رہے گی جو شکاری انسان بتائیں :

Until lions can speak, the only history
will be that of the hunters.

یہی صورت حال وسیع تر معنوں میں خود انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں، مختلف اسباب سے، اصل حقیقت شیر کی مانند بے زبان ہے۔ تمام اہم ترین سچائیاں چھپی ہوئی پڑی ہیں۔ اخبارات میں جھوٹے بیانات چھپ رہے ہیں۔ کتابوں اور مضامین میں ہر آدمی اپنی مرضی کی بات لکھ کر شائع کر رہا ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں کا حال یہ ہے کہ جس کے پاس الفاظ کا ڈھیر ہو، وہ اسٹیج کا ہیرو بن جاتا ہے۔ ان لفظی ہنگاموں کے درمیان اصل حقیقت چھپی ہوئی پڑی ہے۔ وہ اپنا بیان جاری نہیں کرتی۔

تاہم یہ صورت حال صرف اس وقت تک کے لیے ہے " جب تک حقیقت نہ بولے "۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب " حقیقت کا شیر " چنگھاڑ اٹھے گا۔ وہ بول کر لوگوں کو بتائے گا کہ اصل واقعہ کیا تھا اور لوگوں نے اس کو کس طرح پیش کیا۔ انسان اندر سے کیا تھا اور باہر سے وہ اپنے آپ کو کس شکل میں ظاہر کرتا رہا۔ لوگوں کی سرگرمیوں کا اصل مقصد کیا تھا اور دنیا کے اسٹیج پر وہ اپنے آپ کو کس روپ میں ظاہر کرتے رہے۔ موجودہ صورت حال وقتی صورت حال ہے، وہ ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ ضرور ہے کہ فریب کاری کا پردہ پھٹے اور اصل واقعہ اپنی حقیقی صورت میں لوگوں کے سامنے آجائے۔

الرسالہ مئی ۱۹۹۰

تعمیری لاوا

زمین کے اوپر جس طرح ندیاں بہتی ہیں، اسی طرح زمین کے اندر لاوا (Lava) بہتا ہے۔ لاوا پگھلی ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان کا درجہ حرارت ایک ہزار ڈگری یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لاوا اپنی نالیوں (Lava tubes) کے راستہ سے بہتا ہوا کبھی کبھی زمین کے اوپر آجاتا ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر جوالامکھی پھٹ پڑا۔

انسانی آبادیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مثلاً ۹۰-۱۹۸۹ میں کشمیر میں گولی اور بم کا ایک طوفان جاری ہوگیا۔ یہ بھی ایک انسانی لاوا تھا۔ کشمیر کے لوگ ۱۹۴۷ کے بعد سے احساس محرومی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر شکایتوں کا لاوا پک رہا تھا جو آخر کار پھٹ پڑا۔

یہ تخریبی لاوا کی مثال تھی۔ اسی طرح ایک اور لاوا ہے جس کو "تعمیری لاوا" کہہ سکتے ہیں۔ پہلا لاوا تخریب کی نفسیات سے ابھرتا ہے اور دوسرا لاوا تعمیر کی نفسیات سے۔

ایک قوم کے اندر تعمیر ذہن کی تحریک چلائی جائے۔ اس کے اندر ایمان کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ اس کے افراد میں اخلاق و کردار پیدا کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی قوم بنایا جائے جس کے افراد باشعور افراد ہوں۔ یہ کام اگرچہ بظاہر ایک خاموش اور دیر طلب کام ہے، مگر وہ لاوا بننے کے عمل سے کم نہیں۔ جب وہ اپنی آخری حد پر پہونچتا ہے تو وہ تعمیری لاوا بن کر پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ پورے ماحول میں نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

تخریبی لاوا اور تعمیری لاوا دونوں کے نمونے دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تخریبی لاوا کی ایک مثال بم ہے اور تعمیری لاوا کی ایک مثال درخت۔

بم پھٹتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف تکلیف دہ شور بکھیرتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا میں ہر چیز کو برباد کر دیتا ہے۔ بم کا پھٹنا تخریبی لاوا کا پھٹنا ہے۔ جتنا بڑا بم اتنی ہی زیادہ بربادی اور تخریب کاری۔

اس کے بعد درخت کی مثال دیکھئے۔ درخت کا لاوا اس کے بیج کے اندر ہوتا ہے۔ درخت کا ایک بیج جب زمین میں ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی پھٹتا ہے۔ مگر بیج کے پھٹنے سے کوئی شور برپا

نہیں ہوتا۔ بیج کا پھٹنا مکمل طور پر ایک خاموش انفجار ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ بیج جب پھٹتا ہے تو وہ اپنے اندر سے بربادی نہیں نکالتا بلکہ آبادی نکالتا ہے۔ بیج کا پھٹنا ایک سرسبز و شاداب درخت کا ظہور میں آنا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جس کے نیچے لوگوں کو سایہ ملے۔ جس سے پھول کی خوشبو اور پھل کی خوراک حاصل ہو۔

عام انسانی تحریکیں تخریبی انفجار کے ہم معنی ہیں۔ یہ تحریکیں جب پھٹتی ہیں تو لوگوں کو گولی اور بم کا شور سننا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ تباہی اور بربادی کے واقعات لے آتی ہیں۔ پوری انسانی آبادی ان کے نتائج کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔

مگر ایک سچی اسلامی تحریک کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ سچی اسلامی تحریک درخت کے بیج کی مانند ہے۔ اس کا انفجار خاموش انفجار ہوتا ہے۔ سچی اسلامی تحریک سے جو افراد تیار ہوتے ہیں، ان میں کا ہر شخص خدا کا شاداب درخت ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانی گروہ کا پھٹنا خدا کی زمین میں ایک لہلہاتا ہوا باغ وجود میں لاتا ہے۔

ایسے لوگ انسانوں کے لیے سراپا رحمت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ سہتے ہیں تاکہ دوسروں کو نہ سہنا پڑے۔ وہ جاگتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ سوئیں۔ وہ اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ پائیں۔ وہ جھک جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو کھڑا ہونے کا موقع ملے۔ وہ کم پر راضی ہو جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو زیادہ ملے۔ وہ موت کو قبول کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو زندگی حاصل ہو۔ وہ اپنے سینہ کو غم کا قبرستان بناتے ہیں تاکہ دوسروں کے گھروں میں خوشیوں کی بہار آسکے۔

تاریخ میں تخریبی لاوا پھٹنے کی بے شمار مثالیں ہیں، ماضی میں بھی اور حال میں بھی۔ مگر تعمیری لاوا پھٹنے کی کامل مثال معلوم تاریخ میں صرف ایک ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی مثال ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں صحابہ کرام کا اٹھنا اسی قسم کے ایک تعمیری لاوے کا پھٹنا تھا جس کو قرآن میں خیر امت کا اخراج (آل عمران ۱۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان جب تخریبی لاوا پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تخریب بکھیرتا ہے۔ مگر تعمیری لاوا جب پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تعمیر کا چمن اگا دیتا ہے۔ صحابہ کرام کی صورت میں تعمیر کا جو لاوا پھٹا اس نے ساری دنیا کو اسی قسم کے تعمیری نتائج سے بھر دیا۔

واحد حل

دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۲ جنوری ۱۹۹۰) میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے "مسلم بارات میں چاقو چل گیا" اخبار کی رپورٹ کے مطابق خبر حسب ذیل ہے:

" ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ کی شام کو جامع مسجد کے علاقہ میں ایک شادی کی تقریب کے دوران پرانی دشمنی کی وجہ سے چاقو چل گیے۔ گلی شاہ تارا کے ناصر، محمد اقبال اور ان کے ایک ساتھی نے مبینہ طور پر محمد اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر زخمی کر دیا۔ دونوں زخمی جے پرکاش اسپتال میں داخل ہیں، جب کہ تینوں ملزم فرار ہوگیے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذاکر حسین کالج کے زمانہ طالب علمی میں اسلم نے کبھی ناصر کی پٹائی کر دی تھی۔ تب سے دونوں میں رنجش چلی آرہی تھی۔ آج بارات میں ان دونوں کے دوست عادل نے ان کو اپنی شادی پر مدعو کیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ تقریب کے دوران دونوں میں کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں ناصر اور اقبال غصہ ہوگیے اور اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر بھاگ گیے۔ جامع مسجد کی پولیس نے اقدام قتل کا کیس درج کر لیا ہے، تاہم ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی گرفتاری نہیں ہو سکی ہے"

دو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سے اس ہندو مسلم واقعہ کو سمجھا جا سکتا ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر ملک میں جاری ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندوؤں کو یہ شکایت ہوئی کہ مسلمانوں نے ان کی "بھارت ماتا" کے دو ٹکڑے کروا دیے۔ مزید یہ کہ لیڈروں کی حماقت کے نتیجہ میں اس موقع پر دونوں فرقوں میں زبردست مارکاٹ ہوئی۔ ماضی کی یہ تلخ یاد ہندو کے ذہن میں باقی ہے۔ عام حالات میں وہ زندگی کے مسائل کے نیچے دبی رہتی ہے۔ مگر جب کبھی ہندو اور مسلمان کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو جاتی ہے تو ماضی کی تمام یادیں از سر نو جاگ اٹھتی ہیں۔ اب ہندو اپنے انتقامی جذبات کو لے کر مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے عقلمندی یہ ہے کہ وہ "تکرار" کے مواقع کو نہ آنے دیں۔ وہ اعراض کی پالیسی پر عمل کر کے سوئے ہوئے جذبات کو سویا رہنے دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نہیں۔

دکان داری

دکاندار وہ ہے جو دکاندار بننے کے ساتھ گاہک بھی بن جائے۔ جو صرف بیچنے والا نہ ہو، بلکہ اسی کے ساتھ وہ خریدنے والا بھی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بھی جانے اور اسی کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے متوقع خریدار کو بھی۔

دکاندار اور گاہک دونوں بالکل الگ الگ نوعیت کے انسان ہیں۔ دکاندار کا ذہن پیسہ کے رخ پر چلتا ہے، اور گاہک کا ذہن سامان کے رخ پر۔ دکاندار کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے، اور گاہک کی نظر دکان دار کے سامان پر۔ مگر جو دکاندار صرف اتنا ہی جانتا ہو کہ اس کو گاہک کی جیب سے پیسہ نکالنا ہے، وہ کبھی بڑا دکان دار نہیں بن سکتا۔

کامیاب دکاندار وہ ہے جو گاہک کو ایک کتاب کی طرح پڑھے۔ جو گاہک کی ضرورت کو اپنی ضرورت بنائے۔ جو گاہک کے دل کی دھڑکن کو اپنے سینہ میں محسوس کرنے لگے۔ جو یہ جانے کہ گاہک اس سے کیا چاہتا ہے۔ جو یہ جانے کہ گاہک خود اپنی چاہت کے اعتبار سے کس چیز سے مطمئن ہوگا۔

ایک دکاندار وہ ہے جو سڑک پر دکان کھول کر بیٹھ جائے۔ کوئی گاہک آئے تو نرخ نامہ دیکھ کر اس کو دام بتا دے۔ گاہک اگر سامان طلب کرے تو سامان دیدے، اور اگر وہ سامان دیکھ کر رکھ دے تو دکاندار دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ یا اطمینان کے ساتھ اخبار پڑھنے لگے۔

دوسرا دکاندار وہ ہے جس کا جسم دکان میں ہو مگر اس کا دماغ سڑکوں اور بازاروں میں گھوم رہا ہو۔ ذہنی اعتبار سے وہ گاہک کے درمیان چلنے پھرنے لگے۔ گاہک کے بتانے سے پہلے وہ گاہک کی ضرورت اور اس کی طلب کو جانتا ہو۔ وہ گاہک کو یک طرفہ طور پر خوش کرنے کی کوشش کرے، خواہ گاہک نے اپنی کسی بات سے اس کو ناراض کر دیا ہو۔ وہ آخری حد تک گاہک کا ہمدرد بن جائے، خواہ گاہک اس کے یہاں پہلی بار آیا ہو، اور یہ بھی اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔

یہ انسان

پھول کی ایک پنکھڑی یا چڑیا کا ایک چھوٹا پر کتنی حسین چیزیں ہیں ۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بے حد نازک ہیں ۔ ان کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش بھی ان کی حسین ترکیب کو بگاڑ دیتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا خالق بے حد لطیف ذوق والی ہستی ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی اس کے تخلیقی حسن کو دیکھے مگر وہ اس کو ہاتھ نہ لگائے ۔ وہ اس سے اپنی روح کی غذا لے مگر اپنے جسم کی کثافت سے اس کو آلودہ نہ کرے ۔

خدا کی دنیا میں ایک چیز ایسی ہے جو چڑیا کے پر اور پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک ہے ۔ یہ انسان کا دل ہے ۔ ہماری معلوم دنیا میں انسان کے دل سے زیادہ نرم و نازک کوئی چیز نہیں ۔ ایسی حالت میں جو شخص کسی انسان کے دل کو دکھاتا ہے وہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم کرتا ہے ۔ کسی آرٹسٹ کے نازک ترین آرٹ کو جو شخص اپنے پیروں سے مسل دے وہ اس آرٹسٹ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہوگا ۔ اس سے کہیں زیادہ وہ شخص اللہ کی نظر میں مجرم ہے جو ایک نازک دل کو مسلتا ہے ۔ جو ایک انسان کے سکون پر ڈاکہ ڈالتا ہے ۔ جو ایک انسان کے آشیانہ کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے ۔

اس معاملہ میں وہ لوگ اس سے کم مجرم نہیں ہیں جو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر وہ "گونگے شیطان" بنے رہتے ہیں ۔ وہ ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے نہیں اٹھتے ۔ وہ اپنی ممکن کوشش اس کو دفع کرنے میں نہیں لگاتے ۔ پھر اس سے بھی زیادہ بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جو ملت کو مظلومی سے نکالنے کے نام پر قیادت کرتے ہیں مگر جب ملت کا ایک مظلوم فرد ان کے سامنے آتا ہے تو اس کو مظلومی سے نکالنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی ۔ وہ تقریر میں کہتے ہیں کہ ملت کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب ایک ستم زدہ شخص وامعتصماہ پکارے تو ملت اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے اور اس وقت تک کسی کو چین نہ آئے جب تک اس شخص کو ظلم سے نجات حاصل نہ ہو جائے ۔ مگر جب ایک ستم زدہ انسان وامعتصماہ کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز پر دوڑنے کا کوئی جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا ۔

امتحان کا پرچہ

آج کل یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر اپنے لیے ایک شاندار مکان بنائے گا، اور اس کے بعد اس کے اوپر لکھ دے گا: ھذا من فضل ربی (یہ میرے رب کا فضل ہے) بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ میرے خدا کا انعام ہے۔ خدا نے مکان کی صورت میں مجھے اپنی نعمت عطا فرمائی ہے۔ مگر موجودہ شکل میں اس کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن کی یہ آیت سورہ النمل میں آئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جب ملکۂ سبا حاضر ہوئی تو آپ نے اپنے مسخر جناتوں کے ذریعہ اس کا تخت یمن (مارب) سے فلسطین (یروشلم) منگایا۔ قرآن کے بیان کے مطابق، یہ واقعہ پلک جھپکنے کے درمیان ہوا۔ ڈیڑھ ہزار میل دور رکھا ہوا تخت ایک سکنڈ میں حضرت سلیمان ع کے پاس پہونچ گیا۔

حضرت سلیمان ؑ نے جب یہ غیر معمولی واقعہ دیکھا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری (ھذا من فضل ربی، لیبلونی ءاشکر ام اکفر)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پورے قول کو سامنے رکھیے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس "فضل" کو انھوں نے اصلاً آزمائش کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کے نزدیک خدا کا یہ خصوصی معاملہ اس لیے کیا گیا کہ اس کے ذریعہ ان کو آزمائش میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ وہ اس پر شکر کے جذبہ سے جھک جاتے ہیں، یا فخر کے جذبہ کے تحت اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا انعام، اپنے حقیقی معنوں میں، اہل ایمان کو آخرت میں ملنے والا ہے۔ دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ دیا جاتا ہے، وہ دراصل امتحان کا پرچہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد جانچنا ہوتا ہے نہ کہ نوازش کرنا —— اس اعتبار سے اس دنیا کے آرام کی حقیقت بھی وہی ہے جو اس دنیا کی تکلیف کی حقیقت ہے۔ دونوں ہی آدمی کے لیے آزمائش کے پرچے ہیں۔ آرام میں شکر مطلوب ہے اور تکلیف میں صبر۔ دنیا میں خدا کا اصلی انعام یہ ہے کہ وہ آدمی کو یہ توفیق دے کہ وہ آرام میں شکر کا ثبوت دے سکے اور تکلیف میں صبر کا ثبوت۔

آسان حل

الطاف حسین حالی پانی پتی (۱۹۱۴ - ۱۸۳۷) ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں اصلاح کی تحریک چلائی۔ انھوں نے قدیم اردو شاعری پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری مبالغہ اور عشق و عاشقی اور فرضی خیال آرائی کا مجموعہ ہے۔ اس کے بجائے اس کو بامقصد شاعری ہونا چاہیے۔ اس کا ایک نمونہ انھوں نے خود "مسدس" کی صورت میں پیش کیا۔

حالی کی یہ تنقید ان لوگوں کو بہت بری لگی جو اردو شاعری پر ناز کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے فخر بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ حالی کے خلاف نہایت نازیبا قسم کے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔ لکھنؤ کا اخبار "اودھ پنچ" اکثر نہایت برے انداز میں ان کے خلاف لکھتا اور اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کرتا :

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی نے ان بے ہودہ مخالفتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ آخر کار چند سال کے بعد وہ لوگ تھک کر چپ ہو گیے۔ کسی نے حالی سے سوال کیا کہ آپ کے مخالفین کیسے خاموش ہو گیے۔ اس کے جواب میں حالی نے کسی کا نام لیے بغیر یہ شعر کہا :

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

جھوٹی مخالفتوں کا سب سے زیادہ آسان اور کارگر جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جھوٹی مخالفت ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ ڈھ پڑے۔ ایسی مخالفت کا جواب دینا گویا اس کی مدتِ عمر میں اضافہ کرنا ہے۔ اگر آدمی صبر کرلے تو بے جڑ درخت کی طرح ایک روز وہ اپنے آپ گر پڑے گی۔ وہ کبھی دیر تک خدا کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔

جھوٹ کا سب سے بڑا قاتل وقت ہے۔ آپ آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وقت نے اس فتنہ کو زیادہ کامل طور پر ہلاک کر دیا ہے جس کو آپ صرف ناقص طور پر ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے تھے۔

درجات کی بلندی

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ قیامت آنے سے پہلے یہ آزادی ختم ہونے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جس طرح حق اور انصاف کے نمونے ہیں، اسی طرح یہاں ظلم اور زیادتی کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ابدی مسئلہ ہے۔ یہ انسانِ اول (آدم) کے زمانہ میں ہابیل اور قابیل کی نزاع کی صورت میں شروع ہوا اور قیامت کے ظہور تک جاری رہے گا۔ ایسی حالت میں ظلم وزیادتی کے مسائل کا حل کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں رہنمائی دی ہے، اسی طرح آپ نے زندگی کے اس نازک معاملہ میں بھی رہنمائی دی ہے۔ وہ رہنمائی یہ ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، ألا اخبركم بعمل يرفع الله به الدرجات۔ قالوا بلى يا رسول الله۔ قال: تحلُم على من يجهل عليك وتعفو عمن ظلمك وتُعطي من حرمك وتصل من قطعك۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے ذریعہ اللہ درجات کو بلند کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا۔ جو شخص تم سے جہالت کرے تم اس سے درگزر کرو۔ جو شخص تمہارے ساتھ ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ جو شخص تم کو نہ دے تم اسے دو۔ جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جڑو۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس کے مطابق، درجات کی بلندی کا راز یہ ہے کہ آدمی جوابی اخلاق سے مکمل پرہیز کرے۔ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود درگذر کا طریقہ اختیار کرے۔ لوگ ظلم کریں تب بھی وہ انھیں معاف کر دے۔ لوگ محروم کرنے کی سازشیں کریں پھر بھی وہ ان کو دینے کا سلسلہ بند نہ کرے۔ لوگ دوری اختیار کریں تب بھی وہ ان سے قریب ہونے کی کوشش جاری رکھے۔

یہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے جو لوگ اس طریقہ پر چلیں وہ آپ کے مومن ہیں۔ جو لوگ اس طریقہ کو چھوڑ دیں، حتیٰ کہ اپنے زبان وقلم سے اس کی تردید کریں، وہ بلاشبہ آپ کے منکر ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو مومن کامل سمجھتے ہوں۔

تاریخ کا فیصلہ

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت سات سو سال (۷۵۶ء-۱۴۹۲ء) تک جاری رہی۔ یہ حکومت طارق بن زیاد نے عیسائی حکمراں کو شکست دے کر قائم کی تھی۔ آخری مرحلہ میں یہ حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ میں باقی رہ گئی تھی۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سات سو سالہ مدت میں عیسائیوں نے مسلم سلطنت پر کوئی باقاعدہ حملہ کیا ہو۔ پھر یہ طاقت ور سلطنت کیسے ختم ہوگئی۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔

سب سے پہلے بغداد کے عباسی خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۴۶ھ میں عباسی فوج نے سمندر پار کر کے مسلم اسپین پر حملہ کیا۔ وقتی طور پر سلطنت کا ایک حصہ اس وقت کے اسپینی حکمراں عبدالرحمٰن اول کے قبضہ سے نکل گیا۔ عبدالرحمٰن اول نے چند ماہ بعد ہی اپنی سلطنت کو دوبارہ لڑ کر عباسیوں سے واپس لے لیا۔ مگر باہمی لڑائیوں کا یہ سلسلہ پھر کبھی بند نہ ہو سکا۔ صوبائی حاکموں کی طرف سے بغاوت اور باہم ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس دوران بعض عیسائی حکمرانوں نے بھی مسلم حکومتوں کی سرحدوں پر حملے کیے، مگر وہ خود مسلمانوں کے تعاون اور ان کی شہ پر ہوتے تھے۔ آخر کار اسپین کی مسلم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ ہر سردار جو کسی شہر یا صوبہ کا حاکم ہوتا وہ بغاوت کر کے اپنی الگ سلطنت قائم کر لیتا۔ پھر یہ خود مختار ریاستیں چوں کہ اپنی سرحدوں کو مزید بڑھانے کی فکر میں رہتی تھیں۔ اس لیے ان کے درمیان مستقل طور پر باہمی نزاع اور جنگ جاری رہتی تھی۔

ان باہمی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی مسلم سلطنت گھٹتے گھٹتے اسپین کے صرف ایک چھوٹے حصہ میں باقی رہ گئی جس کو تاریخ میں سلطنت غرناطہ کہا جاتا ہے۔ اس سلطنت کا حکمراں ابوعبداللہ آخری مرحلہ میں اتنا کمزور ہو گیا کہ مجبور ہو کر اس نے اپنے قلعہ کی کنجیاں ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو شاہ کسلی فرڈیننڈ (Ferdinand II) کے حوالہ کر دیں، اور بقیہ ایام مراکش میں گزار کر وہیں مر گیا۔

یہی بعد کے زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی کہانی ہے۔ ہر جگہ مسلمان صرف اپنے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں برباد ہوتے ہیں، اگرچہ وہ بطور خود دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔

تباہی کی طرف

اینڈری سخاروف (Andrie Sakharov) روس کے ایک ممتاز سائنس داں تھے۔ وہ ۲۱ مئی ۱۹۲۱ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو انتقال کر گئے۔ انھوں نے مسلسل محنت کے ذریعہ روس کا پہلا ہائیڈروجن بم تیار کیا جس کا اکتوبر ۱۹۵۳ میں کامیاب تجربہ کیا گیا۔ ۱۹۷۵ میں ان کو نوبل انعام دیا گیا۔ انھوں نے ہائیڈروجن بم بنا کر امریکہ کے مقابلہ میں روس کو ہتھیار میں برابری عطا کی۔ چنانچہ وہ روس کے نیشنل ہیرو بن گئے۔ مگر اس کے بعد انسانی بنیاد پر وہ بم سازی کے خلاف ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں تمام اعزازات سے محروم کرکے انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ان کو ماسکو سے ۴۰۰ کیلومیٹر دور گورکی میں نظر بند کر دیا گیا:

He secured the Soviets strategic parity with the Americans by developing the hydrogen bomb but suffered internal exile for championing human rights.

موجودہ روسی وزیر اعظم میکائیل گورباچوف نے دسمبر ۱۹۸۶ میں اینڈری سخاروف کو آزاد کر دیا تھا۔ تاہم وہ روس میں مکمل شہری آزادی لانے کے نام پر مسٹر گورباچوف کے بھی مخالف بنے رہے۔ وہ اپنے آپ کو فری تھنکر کہتے تھے۔ ان کی موت اچانک حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہوئی۔ موت سے صرف چند گھنٹہ پہلے انھوں نے ماسکو میں اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ مسٹر گورباچوف کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے:

Only hours before his death, he told fellow opposition members of the Congress that the Communist party leadership, headed by Mr Gorbachov, was leading the country to catastrophe.

اینڈری سخاروف کی مثال تمام انسانوں کی مثال ہے۔ انسان خود موت کی عظیم تر تباہی کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر وہ دوسروں کو ان کی تباہی کی خبر دے رہا ہے۔ وہ محاسبۂ خداوندی کی میزان میں تولا جانے والا ہے۔ مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے کے عنوان پر تقریریں کر رہا ہے۔

کیسا عجیب ہے یہ انسان جس کو صرف دوسروں کی خبر ہے، خود اپنی ذات کی اس کو خبر نہیں۔

قابل غور

اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہولناک واقعہ وہ ہے جس کو "تاتاری حملہ" کہا جاتا ہے۔ منگول قبائل تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر ٹوٹ پڑے اور سمرقند سے لے کر عراق تک ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ ۱۲۵۸ء میں وہ ہلاکو کی سرداری میں بغداد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے شہر کو ڈھا دیا اور تقریباً ۸ لاکھ آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ آخری عباسی خلیفہ المعتصم کو ذلت کے ساتھ قتل کر دیا۔ اس وقت ایک مسلمان عالم الحافظ ابن سید الناس زندہ تھے۔ کچھ لوگ ان کے پاس گیے اور کہا کہ مسلمانوں کی بربادی اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ اس کے باوجود اللہ کی رحمت و نصرت نازل نہیں ہو رہی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ بزرگ نے جواب دیا:

أنتم تستبطئون الرحم وانی أستبطئ الرجم — تم سمجھتے ہو کہ رحمت اترنے میں دیر ہو رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آسمان سے پتھر برسنے میں دیر ہو رہی ہے۔

صحیح بخاری میں زبیر بن عدی سے روایت آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت انس بن مالک کے پاس گیے اور حجاج کے ظلم کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ صبر کرو۔ کیوں کہ اب تمہارے اوپر جو بھی زمانہ آئے گا وہ پہلے سے زیادہ برا ہوگا۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے مل جاؤ۔ ایسا ہی میں نے تمہارے نبی سے سنا ہے (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۸۳)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھئے تو آج کا زمانہ مسلمانوں کے زوال کے اعتبار سے پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ برا ہے۔ آج مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کا داخلی بگاڑ ہے نہ کہ دوسری قوموں کا ظلم۔ یہ حقیقت آج ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ آپ جس مسلمان سے بات کیجئے، وہ مسلمانوں کی برائی کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ وہ کہے گا کہ مسلمان اپنے دینی اور اخلاقی زوال کی انتہا پر ہیں۔ مگر جب ہندو اور مسلمان کی بات ہو تو وہی مسلمان فوراً یکطرفہ طور پر ہندو کی برائی کرنے لگے گا۔ اب اچانک مسلمان "خیر امت" بن جائیں گے اور ہندو "کفار لا اعتبار" کا درجہ اختیار کر لیں گے۔

یہ عصبیت جاہلیہ ہے۔ اس کا نام قوم پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

سماجی برائی

سگرٹ کو موجودہ زمانہ میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ مگر سائنسی تحقیقات بتاتی ہیں کہ سگرٹ پینا زبردست نقصان کا باعث ہے۔ مغربی ماہرین نے تجربات کے بعد بتایا ہے کہ سگرٹ پینے سے ایک آدمی کی زندگی کے ۵۰۰ ۲۲ دن کم ہوجاتے ہیں۔ سگرٹ نہ پینے والوں کے مقابلہ میں سگرٹ پینے والے دس گنا زیادہ دل کے مریض ہوتے ہیں۔ سگرٹ پینے والے کثرت سے اچانک موت کا شکار ہوتے ہوئے پائے گیے ہیں، وغیرہ۔

سگرٹ پینے کے نقصانات اب ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکے ہیں۔ پچھلے پچاس سال سے مختلف صورتوں میں یہ الفاظ لوگوں کے دماغ میں ڈالے جاتے رہے ہیں کہ تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔ مگر تازہ تحقیقات نے اس معاملہ میں انقلابی تبدیلی کی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ صرف تمباکو پینا خطرناک نہیں ہے، بلکہ تمباکو پینے والے سماج میں رہنا بھی خطرناک ہے۔ چنانچہ اب ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی ہے جس کو منفعل تمباکو نوشی (passive smoking) کہا جاتا ہے۔ تمباکو پینے والا جو دھواں نکالتا ہے۔ وہ اس کے منہ سے نکل کر ہوا میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس آلودہ ہوا میں لوگ سانس لیتے ہیں۔ اس طرح ہر آدمی تک اس کا ایک حصہ پہونچتا رہتا ہے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ فعال تمباکو نوشی (active smoking) کے جو نقصانات ہیں، وہی تمام نقصانات منفعل تمباکو نوشی کے بھی ہیں۔ مثلاً دہلی میں رہنے والا ہر آدمی خواہ وہ براہ راست سگرٹ نہ پیتا ہو، مگر بالواسطہ انداز میں وہ روزانہ ۱۰ سے ۲۰ سگرٹ تک پی رہا ہے۔ اس طرح اس کی صحت کے لیے بھی انھیں خطرات کا اندیشہ ہے جو باضابطہ سگرٹ پینے والے کے لیے ہے۔ سگرٹ کے خلاف مہم چلانے والوں کا نعرہ پہلے یہ تھا کہ "تمہاری تمباکو نوشی تمہاری صحت کے لیے مضر ہے"۔ مگر اب انھوں نے نیا نعرہ وضع کیا ہے ——— تمہاری تمباکو نوشی میری صحت کے لیے مضر ہے:

Your smoking is injurious to my health.

اگر آپ برائی سے پاک رہنا چاہتے ہیں تو پورے سماج کو برائی سے پاک کرنے کی کوشش کیجیے۔ سماج اگر برائی میں مبتلا ہو تو فرد بھی اپنے آپ کو اس برائی کے اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

قیادت کا مسئلہ

وائیلٹ گراف (Violette Graff) ایک فرانسیسی خاتون ہیں جو ہندستان کی مذہبی اقلیتوں کی ماہر (specialist) سمجھی جاتی ہیں۔ مسٹر دیکو نراونی (Naravne) نے پیرس میں ان کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Religious pluralism is India's wealth

گفتگو کے دوران ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم اقلیت کے مسائل کا ذکر آیا۔ انٹرویور نے پوچھا کہ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گی کہ ہندستان کی مسلم اقلیت اس لیے نقصان اٹھا رہی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک جاندار قیادت (viable leadership) پیدا نہ کر سکی۔

خاتون نے جواب دیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے درمیان ایک جاندار اور فعال قیادت کا ابھرنا موجودہ حالات میں سخت مشکل ہے۔ کیوں کہ ایک اعتبار سے وہ خطرناک ہے، اور دوسرے اعتبار سے ناقابل عمل۔ جناح کے انداز کا کوئی واحد لیڈر اگر مسلمانوں میں ابھرے تو حکومت فوراً اس کو علٰحدگی پسند (separatist) قرار دیدے گی۔ اس کو "نیا جناح" کہا جانے لگے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ حکومت سے قریب ہو اور مفاہمتی انداز کی بات کرے تو وہ مسلمانوں کی نظر میں شومین (showman) قرار پائے گا۔ وہ اس کو حکومت (یا ہندو) کا ایجنٹ کہہ کر رد کر دیں گے۔

یہ ایک نہایت پیچیدہ صورت حال ہے جس سے ہندستان کے موجودہ مسلمان دوچار ہیں۔ اور بلاشبہ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ابھی تک مسلمانوں کے درمیان کوئی طاقت ور قیادت پیدا نہ ہو سکی۔ کیوں کہ "جناح" کے انداز کی قیادت حکومت کی نظر میں غیر معتبر بن جاتی ہے اور "سرسید" کے انداز کی قیادت مسلمانوں کی نگاہ میں غیر معتبر قرار پاتی ہے۔ جو چیز ممکن ہے وہ مفید نہیں، جو چیز مفید ہے وہ ممکن نہیں۔

مسلمان حکومت کی (یا اکثریتی طبقہ کی) سوچ کو بدل نہیں سکتے۔ انھیں چاہیے کہ وہ خود اپنی سوچ کو بدل لیں تاکہ ان کے اندر طاقت ور قیادت ابھرے اور تعمیر ملت کا وہ کام انجام پا سکے جو نصف صدی سے رکا ہوا پڑا ہے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

امت کا بگاڑ

حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں جب امتِ مسلمہ کے اندر بگاڑ آئے گا تو اس کے افراد میں دس قسم کی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کی بات مانے گا اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا۔ وہ اپنے دوست سے قریب ہوگا اور باپ سے دور ہو جائے گا (اطاع الرجل امرأته وعق امه وادنى صديقه واقصى اباه، الترمذی)

بیوی کسی آدمی کے لیے دل چسپیوں کا مرکز ہوتی ہے جب کہ ماں کا وجود ذمہ داریوں کی علامت ہے۔ اسی طرح باپ کے ساتھ فرماں برداری کا تصور وابستہ ہوتا ہے اور دوست کے ساتھ تفریح کا۔ آدمی کا ماں باپ کو چھوڑ دینا اور اپنی بیوی اور اپنے دوستوں سے قریب ہونا دراصل بڑھی ہوئی دنیا پرستی کا نتیجہ ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے دل چسپی یا اپنے دوستوں سے رغبت بجائے خود فطری چیزیں ہیں۔ مگر جب آدمی کا مزاج آخرت پسندانہ ہو تو ان چیزوں کو وہ ضرورت کے دائرہ میں محدود رکھتا ہے، وہ اپنے جی کے میلان پر پابندی قائم رکھتے ہوئے والدین کے بارہ میں اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرتا رہتا ہے۔ مگر جب آخرت کے عقیدہ پر دنیا پرستی کا رجحان غالب آجاتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب آدمی ہمہ تن اپنے دوستوں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جاتا ہے اور ماں باپ سے عملاً بے تعلق ہو جاتا ہے، اور اگر تعلق رکھتا بھی ہے تو محض زبان اور الفاظ کا۔ اس کا بہترین مشغلہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے درمیان خوش وقتی کے لمحات گزارے۔ اس کے لطف ولذت کے اوقات وہ ہوتے ہیں جب کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے درمیان ہو اور ان سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہو۔ اس کا وقت، اس کا پیسہ، اس کے جذبات، اس کا پورا وجود اپنے بیوی بچوں کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے اس کے پاس رسمی باتوں کے سوا کچھ اور نہیں رہتا۔

قوم پر ایسا وقت آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افراد پابندی کے بجائے بے فکری کو پسند کرنے لگے ہیں۔ ان کو ذمہ دارانہ زندگی کے مقابلہ میں بے قید زندگی زیادہ محبوب ہو گئی ہے۔ افراد کا یہی مزاج قوم کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اسلوب دعوت کا مسئلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے تقریباً تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ یہ آپ کی زندگی کا خالص دعوتی مرحلہ تھا۔ اس ابتدائی مرحلہ کی تفصیل بتاتے ہوئے ابن اسحاق کہتے ہیں :

فلما بادیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصَدَع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومُہ ولم یردّوا علیہ، حتی ذکر آلھتَھم وعابھا۔ فلمّا فعل ذٰلک اَعْظَموہ ونا کروہ و اجمعوا خلافَہ وعداوتَہ

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۵-۲۷۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا جیسا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا، تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ آپ کا رد کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگایا۔ تو جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کو اہمیت دی اور اس کا انکار کیا اور آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گیے۔

اس بیان میں "عیب" سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل تنقید کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی (تین سال) تک سادہ اور غیر تنقیدی انداز میں قریش کے سامنے اپنی بات رکھی۔ اس کے بعد آپ نے تنقیدی انداز اختیار فرمایا۔ ابتدائی مرحلہ میں آپ کے مخاطبین نے کوئی برہمی ظاہر نہیں کی۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں (بالفاظ دیگر اکابر قوم) پر تنقید کی تو وہ سخت برہم اور مشتعل ہو گیے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر مستقل طور پر غیر تنقیدی انداز میں کلام کرتے رہتے اور قرآن میں بھی تنقیدی آیتیں نہ اترتیں تو عرب کے لوگ وہ مخالفت اور دشمنی اختیار نہ کرتے جو انھوں نے بعد کو اختیار کی۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تنقیدی اسلوب پر قائم رہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر تنقیدی نوعیت کا روحانی اور اخلاقی انداز ذاتی مقبولیت یا عوامی بھیڑ جمع کرنے کے لیے تو بہت کارآمد ہے، مگر وہ اصل مقصد کے لیے کارآمد نہیں۔ غیر تنقیدی انداز لوگوں کو سننے میں بہت اچھا لگتا ہے، مگر وہ ذہنوں میں ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس سے وہ فکری انقلاب نہیں آتا، جب کہ آدمی کی سوچنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔ اس پر ایک چیز کا غلط ہونا منکشف ہوتا ہے اور دوسری چیز کے صحیح ہونے کو وہ شعوری طور پر دریافت کرتا ہے۔ اسلام کو وہ افراد مطلوب ہیں جو انقلابی (کرانتکاری) ذہن رکھتے ہوں، اور تنقیدی اندازِ دعوت کے بغیر ایسے افراد کا بننا ہرگز ممکن نہیں۔

غیر تنقیدی اسلوب غیر فطری اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک غیر تنقیدی انداز میں چلائی جائے، اس سے مصنوعی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ کبھی مطلوب اسلامی شخصیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

رات کے وقت تالاب میں شبنم گرتی ہے۔ مگر اس سے تالاب کے پانی میں کوئی تموج پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی تالاب میں ایک بڑا پتھر پھینک دیجیے تو اس سے ٹھہرے ہوتے پانی میں زبردست تموج پیدا ہو جائے گا۔ اس مثال سے تنقیدی اور غیر تنقیدی اسلوب کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غیر تنقیدی اسلوب شبنم کی مانند ہے۔ اس سے آدمی کو ایک روحانی سکون تو ملتا ہے مگر اس سے اس کے سینہ میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

مگر یہ مطلوب اسلامی شخصیت نہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے (الایمان بین الرجاء والخوف) مومن کو ایک طرف امید ہوتی ہے کہ خدا رحیم وکریم ہے، وہ اس کو بخش دے گا۔ دوسری طرف اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا عادل ہے، وہ اس سے حساب لے گا، اور جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوا (من نوقش فقد هلك) اس بنا پر مومن ہمیشہ "ففی ففی" کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک پر اضطراب شخصیت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اصحاب رسول ہمیشہ اضطراب کی نفسیات میں رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی پرسکون شخصیت کا حامل نہ تھا۔

ایمان موجودہ دنیا میں درد ہے اور آخرت میں راحت۔

پیغمبر کا فیصلہ

بخاری اور مسلم نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے خطبہ دیا اور ہر وہ بات بیان کی جو آپ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک ہونے والی تھی (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۸۰)

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں مستقبل کی باتیں نقل کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بات وہ ہے جو ابو داؤد نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

عَن ثوبانَ قال قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُوشِكُ الأُمَمُ ان تَداعى عليكم كما تَداعى الأَكَلَةُ الى قَصعَتِها۔ فقال قائلٌ: ومن قلةٍ نحن يومئذٍ۔ قال بل انتم يومئذٍ كثيرٌ ولكنكم غثاءٌ كغثاءِ السيل و لينزعنّ اللهُ من صدورِ عدوكم المهابةَ منكم وليقذفنّ في قلوبكم الوهن۔ قيل وما الوهنُ يا رسولَ الله۔ قال حبُّ الدنيا وكراهيةُ الموت۔

(جامع الاصول، ۱۰ / ۲۸)

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ قومیں تمہارے اوپر ٹوٹ پڑیں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا، کیا اس لیے کہ اس وقت ہم لوگ کم تعداد میں ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس وقت تم لوگ بہت زیادہ ہوگے۔ مگر تم لوگ سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکال دے گا۔ اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، کمزوری کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت، اور موت کو ناپسند کرنا۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے اور امت مسلمہ کے موجودہ حالات کو دیکھئے۔ معلوم ہوگا کہ آج امت پر عین وہی زمانہ آگیا ہے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ۱۴ سو سال پہلے

پیشین گوئی فرمائی تھی۔ موجودہ مسلمان، خواہ وہ اقلیتی ملک میں ہوں یا اکثریتی ملک میں، ہر جگہ وہ دوسری قوموں کے استحصال اور زیادتی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ارب کی غیر معمولی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ حقیر اور مظلوم بنے ہوئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آنے والے دور کے بارہ میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کی قومیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گی اور ان کو اپنے ظلم اور استحصال کا نشانہ بنائیں گی۔ مگر اس خارجی مسئلہ کا سبب تمام تر داخلی مسئلہ بتایا گیا ہے۔ اس میں کھلے لفظوں میں یہ نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ ناموافق صورت حال اس لیے پیش آئے گی کہ مسلمان دنیا کی طلب میں پھنس جائیں گے اور اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ دینی مقصد کے لیے قربانی کرنے کا جذبہ ان کے اندر باقی نہیں رہے گا۔ گویا مسئلہ باہر سے پیدا ہوگا مگر اس کا سبب خود مسلمانوں کے اپنے اندر ہوگا۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ان الفاظ کو دیکھئے جو ان کے تمام اصاغر و اکابر لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کے سب بلا استثنار ایک ہی بولی بول رہے ہیں۔ اور وہ ہے ــــــ اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے خلاف لامتناہی چیخ پکار جاری رکھنا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اس معاملہ میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کا سب الفاظ کے فرق کے ساتھ ایک ہی ہے، اور وہ دوسری قوموں کی مذمت ہے۔ ان میں سے کوئی مؤامرہ کا لفظ بولتا ہے اور کوئی سازش کا اور کوئی (conspiracy) کا۔ مگر سب کے کلام کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دوسری قومیں ہمارے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ دوسری قومیں ہمارے اوپر ظلم کر رہی ہیں۔ دوسروں نے ہمیں تباہی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔

مسلمان اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت پر دھیان دیتے تو وہ اپنی ساری کوشش اپنی اندرونی کمیوں کو دور کرنے پر لگا دیتے۔ مگر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا اور بڑا، اور ان کا ہر لکھنے اور بولنے والا

غیر قوموں کی سازشوں کا انکشاف کرنے میں مشغول ہے۔ وہ دوسروں کے ظلم پر احتجاج کرنے میں اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے یہی روگردانی موجودہ مسلمانوں کی تمام بربادیوں کا اصل سبب ہے۔ مسئلہ کے اصل سبب کو دور کرنے کے لیے وہ کوئی محنت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ایک فرضی چیز کو سبب قرار دے کر اس کے اوپر اپنی ساری توانائیاں خرچ کر رہے ہیں۔ ایسی ہر کوشش لغویت کی حد تک بے معنی ہے۔ اس کا ہرگز کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ خواہ مسلمان پچاس ہزار سال تک اس کی چٹان پر اپنا سر پٹکتے رہیں۔

علم طب اگر کسی بیماری کے بارہ میں یہ بتائے کہ اس کا سبب انسان کے جسم کے اندر ہے تو کوئی آدمی یہ نادانی نہیں کرے گا کہ وہ اس قسم کے مرض کے علاج کے لیے بیرونی مرہم تلاش کرنے لگے۔ کوئی مشین کام نہ کر رہی ہو، اور انجینیر اس کو دیکھ کر کہے کہ اس کا سبب اس کے اندرونی پرزہ کی خرابی ہے، تو کوئی آدمی مشین کے باہر پالش کر کے اس کو چلانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مگر مسلمانوں کے مسئلہ کے بارہ میں ان کے پیغمبر کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ ان کے مسئلہ کا سبب ان کا داخلی نقص ہے نہ کہ بیرونی سازش، اس کے باوجود مسلمانوں کے تمام رہنما بیرونی سازشوں کا انکشاف کر رہے ہیں اور ان کے خلاف چیخ پکار کرنے میں مشغول ہیں۔ شاید موجودہ مسلمانوں کو پیغمبر کی رہنمائی پر اتنا یقین بھی نہیں ہے جتنا ایک مریض کو اپنے ڈاکٹر پر اور ایک مشین والے کو اپنے انجینیر پر ہوتا ہے۔

مارکسزم کا خاتمہ

مارکسی اشتراکیت کے بارہ میں راقم الحروف نے ۱۹۵۸ میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کر چکی ہے۔

یہ نام اس وقت بڑا عجیب تھا۔ چنانچہ نہ صرف اشتراکی حضرات نے بلکہ اسلام پسند حضرات میں بھی بہت سے لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ان کا خیال تھا کہ مارکسزم تو ایک زندہ حقیقت ہے ایسی حالت میں اس کے رد ہونے کا کیا سوال۔ مگر آج کتاب کا یہ نام ایک ایسا واقعہ بن چکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ خود سوویت روس کے لوگوں کو بھی نہیں۔ مارکسزم آج نظری اور عملی دونوں اعتبار سے ایک ختم شدہ نظام بن چکا ہے۔

ٹائم امریکہ کا مشہور ہفت روزہ میگزین ہے۔ وہ ہر سال کسی ممتاز آدمی کو سال کی شخصیت (Man of the year) قرار دیتا ہے اور اس کے بارہ میں خصوصی مضامین شائع کرتا ہے۔ پہلی بار ۱۹۲۷ میں اس نے چارلس لنڈبرگ (Charles Lindberg) کو اس مقصد کے لئے چنا تھا۔ ۱۹۳۰ میں اس نے مہاتما گاندھی کو سال کی شخصیت قرار دیا۔ ٹائم کا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ اس سلسلہ میں ایک غیر معمولی شمارہ ہے۔ اس میں روس کے صدر مسٹر میخائیل گورباچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the decade) قرار دیا گیا ہے۔

The Hindustan Times, January 1, 1990
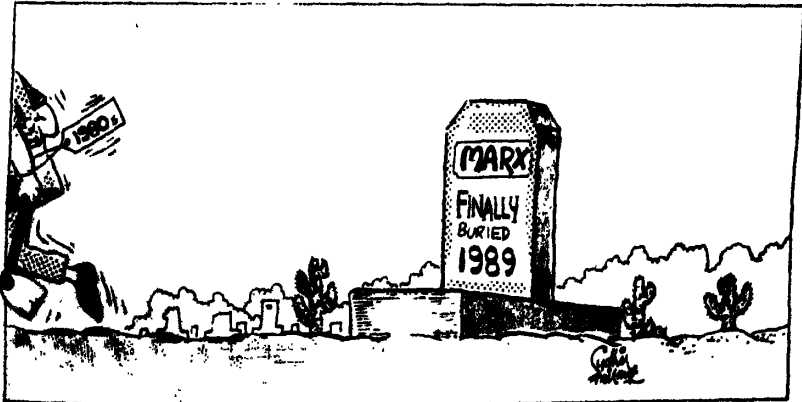
اشتراکی روس کے حکمراں کو یہ غیر معمولی اعزاز دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اشتراکیت کے قلعہ میں کوئی اضافہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اشتراکیت کا قلعہ توڑ دیا۔ آج ساری دنیا کے اخبارات میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخی اس قسم کی ہوتی ہے :

Marxism is over.
Fragmented empire of the U.S.S.R.

ہندستان ٹائمس (یکم جنوری ۱۹۹۰) نے کیمونسٹ دنیا میں تبدیلی اور مارکسی فکر کے انہدام پر ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بامعنی کارٹون شامل کیا ہے۔ اس کارٹون میں اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کی قبر دکھائی گئی ہے۔ قبر کے پتھر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

Marx — Finally Buried 1989

قرآن میں ہے کہ اللہ اپنے امر پر غالب آکر رہتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے (یوسف ۲۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی دنیا میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ اللہ کے اسی قانون کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔

مارکسی اشتراکیت خدا اور مذہب کی نفی تھی۔ اس نے مذہب کو بے حقیقت بتاکر اس کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ کارل مارکس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے :

Criticism of the Hegelian Philosophy of Right

اس کتاب کے ابتدائی مضمون (انٹروڈکشن) میں مارکس نے لکھا ہے کہ مذہب عوام کی افیون ہے :

Religion is the opium of the people.

مارکس کا نظریہ مختلف ملکوں میں پھیلا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۷ میں اس کی بنیاد پر روس میں ایک طاقت ور حکومت قائم ہوگئی۔ پہلی عالمی جنگ میں اشتراکی روس کو مزید موقع ملا اور اس کی سلطنت کا رقبہ بہت زیادہ وسیع ہوگیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اتنی زبردست فوجی طاقت حاصل کرلی کہ وہ دو سپر پاور میں سے ایک شمار کیا جانے لگا۔

اشتراکی لیڈروں نے ریاستی طاقت کی مدد سے " دوسری دنیا " میں مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ مذہب کے تمام نشانات کو مٹا دیا۔ اسٹالن کے زمانہ میں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی قتل کر دئے گئے۔

پورے سوویت یونین میں مکمل طور پر جبر کی حکومت قائم کر دی گئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ مذہبی کام کے مواقع اب صرف پہلی دنیا اور تیسری دنیا میں ہیں۔ دوسری دنیا میں مذہب کو اب کوئی موقع ملنے والا نہیں۔

مگر مذکورہ آیت کے مطابق، اللہ کی طاقت نے کام کیا۔ خود سوویت یونین کے اندر ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ روس کا اشتراکی قلعہ متزلزل ہوگیا۔ حتی کہ اس کی اینٹیں نکل نکل کر بکھرنے لگیں۔ روسی کیمپ میں ہونے والا یہی واقعہ ہے جس کی سرخی امریکی میگزین نیوز ویک (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹) نے ان لفظوں میں قائم کی ہے کہ اشتراکی دنیا میں کایا پلٹ (A world transformed)

ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے اس سلسلہ میں روس کے نظام میں تبدیلی پر تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تقریباً ۵۵ ملین سوویت مسلمان مذہبی رواداری (religious tolerance) کے بارہ میں نئی روسی پالیسی کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اس رپورٹ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے —— کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے: Karl Marx makes room for Muhammad

روسی علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۲۰ فی صد ہے۔ سابق روسی حکمراں جوزف اسٹالن نے ۱۹۳۲ میں روس سے مذہب کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۱۷ سے پہلے روس میں ۲۶ ہزار مسجدیں تھیں۔ چند کو چھوڑ کر سب کی سب مسجدیں بند کر دی گئیں یا توڑ کر ختم کر دی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مذہبی مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ چار سال پہلے خود گورباچیف نے اسلام کو ترقی کا دشمن (enemy of progress) بتایا تھا۔ مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔

کچھ سال پہلے تک روس میں قرآن کی حیثیت ایک ممنوعہ کتاب کی تھی۔ آج یہ حال ہے کہ سعودی عرب نے قرآن کے ایک ملین نسخے روس بھیجنے کا اعلان کیا تو روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ (Aeroflot) اس پر راضی ہوگئی کہ وہ قرآن کے ان نسخوں کو سعودی عرب سے روس لے جانے کی خدمت انجام دے گی۔

خدا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں مکمل مذہبی آزادی موجود ہو۔ سوویت روس کے اشتراکی حکمرانوں نے اس آزادی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ آخر کار خدا کی طاقت ظاہر ہوئی۔ اس نے اشتراکی قلعہ کو اس طرح توڑ دیا جیسے کہ وہ قلعہ نہ تھا، بلکہ کا ایک گھروندا تھا جو ہوا کے ایک جھونکے سے بکھر کر رہ گیا۔

حکیمانہ تدبیر

دنیا مقابلہ کا میدان ہے۔ یہ مقابلہ اول دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ مقابلہ کا یہ نظام خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اس لئے کوئی شخص یا قوم اس کو بدلنے پر قادر نہیں، خواہ وہ اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ فریاد اور احتجاج کرے۔

مقابلہ کی اس دنیا میں کوئی شخص صرف حکیمانہ تدبیر سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ حکیمانہ تدبیر سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھے اور ایسے حالات پیدا کرے جس میں فیصلہ کا سرا اس کے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ اس بات کو ایک لطیفہ سے بخوبی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی میں دوستی تھی۔ ایک بار لومڑی نے سارس سے کہا کہ آؤ ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان تم لاؤ اور کچھ سامان میں لاؤں۔ اس طرح کھیر تیار کی جائے اور پھر دونوں مل کر اسے کھائیں۔ چنانچہ دونوں سامان لے آئے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔

جب کھیر کو نکال کر برتن میں رکھنے کا وقت آیا تو لومڑی فوراً ایک تھال لے آئی۔ اس نے کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ کھیر کو تھال میں رکھ کر لومڑی نے کھانا شروع کر دیا اور سارس سے کہا کہ آؤ تم بھی کھاؤ۔ تھال جیسے برتن میں کھانا لومڑی کے لئے آسان تھا۔ چنانچہ لومڑی ساری کھیر کھا گئی۔ سارس اپنی لمبی چونچ پھیلے ہوئے تھال میں ادھر ادھر مارتا رہا مگر وہ کھیر کی بہت کم مقدار حاصل کر سکا۔

سارس نے اپنے دل میں کہا کہ لومڑی نے تو اس طرح مجھے بیوقوف بنا دیا۔ آخر کار اس نے سوچ کر ایک تدبیر نکالی۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ایک بار اور ہم دونوں مل کر کھیر پکائیں۔ دوبارہ دونوں سامان لے آئے۔ اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب سارس نے پیشگی منصوبہ کے مطابق فوراً ایک صراحی لاکر رکھ دی۔ اور کہا کہ کھیر اس میں رکھی جائے گی۔ چنانچہ کھیر نکال کر صراحی میں رکھ دی گئی۔ سارس نے فوراً صراحی کے منھ میں اپنی لمبی چونچ ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اب صورت حال سارس کے حق میں تھی۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھائی اور لومڑی بھوکی رہ گئی۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں سارس اور لومڑی کی یہی کہانی دہرائی جارہی ہے۔ جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ اس میں سے حصہ پاتے ہیں، اور جو لوگ کھیر کو اپنے موافق برتن میں نہیں رکھ پاتے وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس تدبیر کی ایک شاندار مثال صلح حدیبیہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد آپ کے مخالفین (قریش) یہ چاہتے تھے کہ وہ آپ کے اور آپ کے معاملہ کو جنگ کے میدان میں طے کریں۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے میدان میں وہ زیادہ موافق پوزیشن میں ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ معاملہ کو امن کے ماحول میں لے آئیں۔ کیوں کہ امن کے ماحول میں نظریہ فیصلہ کن بنتا، اور نظریہ کے اعتبار سے شرک کے مقابلہ میں توحید کو واضح طور پر زیادہ برتر پوزیشن حاصل تھی۔ صلح حدیبیہ نے اسلام کو یہی موافق میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد دو سال سے بھی کم عرصہ میں مکہ فتح ہوگیا۔

اب ہندستان کے مخصوص حالات کے اعتبار سے اس معاملہ پر غور کیجئے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا مقابلہ ہندو فرقہ سے ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو ان کے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں انھیں سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نقصان کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر یہ نقصان خود مسلمانوں کے سطحی قائدین کی نادانی کی بنا پر پیش آرہا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی کم فہمی کی بنا پر مذکورہ تدبیر کو مسلمانوں کے حق میں استعمال نہ کرسکے۔

ہندو قوم اس وقت تین بڑے طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ طبقہ جو ملک کے اکثر انتظامی اور سماجی عہدوں پر قابض ہے۔ دوسرا تاجر طبقہ جو ملک کی بیشتر اقتصادیات پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ تیسرا گروہ ہندو عوام اور پس ماندہ طبقات کا ہے۔ جو تعداد کے اعتبار سے ہندو قوم کا زیادہ بڑا حصہ ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تعلیمی مزاج کی بنا پر سیکولر یا سائنٹفک ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر فرقہ وارانہ انداز کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں رائے قائم کرتا ہے۔ تاجر طبقہ کے سامنے اصلاً اس کا تجارتی مفاد ہے۔ چوں کہ تجارت کی مشین کو جاری رکھنے کے لئے امن ضروری ہے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ملک میں امن کا ماحول قائم رہے۔ تاکہ اس کے تجارتی عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

تیسرا طبقہ زیادہ تر غریب اور بے روزگار یا کم آمدنی والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی طبقہ اصلاً تمام فساد میں ملوث ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ دنگے اور فساد میں ہے۔ کیوں کہ فساد میں اس کو لوٹنے کا موقع ملتا ہے۔ پر امن حالات میں لوٹنے والا فوراً فوجداری قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ مگر فساد کے موقع پر جو لوگ لوٹ مار کرتے ہیں ان کو یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ ملک کے موجودہ نظام میں ان کی کوئی قانونی پکڑ ہونے والی نہیں۔

ہندو قوم کے ان تین طبقات کو آسانی کی خاطر دو گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ پہلے اور دوسرے طبقہ کا۔ یہ پہلا گروہ اپنے مزاج یا اپنے مفاد کے تحت فساد اور بد نظمی کو نہیں چاہتا۔ البتہ ان کے علاوہ ہندوؤں کا جو عوامی گروہ ہے اس کی ایک تعداد فساد میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس گروہ کے افراد فرقہ پرست تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ جلوس نکالتے ہیں اور مسلم مخالف نعرے بلند کرتے ہیں۔ یہی لوگ مختلف طریقوں سے ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن سے مسلمان مشتعل ہو کر تشدد کریں۔ تاکہ انھیں مسلم بستیوں میں لوٹ مار کا موقع مل سکے۔

اب مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ ملک میں جب بھی فرقہ وارانہ مسئلہ یا کشیدگی کی صورت پیدا ہو تو وہ "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کریں۔ یعنی وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کی کوشش کریں کہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے اس کو پہلے گروہ (ہندو خواص) کی سطح پر لایا جائے۔ وہ دوسرے گروہ (ہندو عوام) کی سطح پر نہ جانے پائے۔ پہلے گروہ کی سطح پر معاملہ کا فیصلہ کیا جائے تو یہ فیصلہ ہمیشہ مسلمانوں کے موافق ہوگا۔ اور اگر وہ دوسرے گروہ کی سطح پر چلا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو جائے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک واقعاتی مثال لیجئے۔ یہ مثال موافق برتن اور مخالف برتن کے نظریہ کو بہت اچھی طرح واضح کر رہی ہے۔

ایک واقعہ

مدراس میں ۲۰ ویلج روڈ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد مسلم ویلفیئر اسوسی ایشن کے زیر انتظام ہے۔ اس مسجد پر اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا تو علاقہ کے کچھ ہندوؤں کو اس پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے پولیس سے شکایت کی کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان سے ہمارے گھروں میں ہمارے سکون [illegible]

میں خلل واقع ہوتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو لاؤڈ اسپیکر پر اذان دینے سے روکا جائے۔ مگر مدراس پولیس نے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہیں کی۔

اس کے بعد ایک مقامی ہندو نے مدراس ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ لاؤڈ اسپیکر کی اذان مقامی ہندؤوں کے لیے تکلیف (Nuisance) کا باعث ہے، اس لیے اس کو بند کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔

جسٹس بکتاوت سولم نے دونوں فریقوں کے بیانات سننے کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ کو اپنا فیصلہ سنایا۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں عدالت کو مداخلت کرنی چاہیے۔ مدعی کے دلائل میری نظر میں تشفی بخش نہیں ہیں۔ ایک جمہوری ملک میں ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرے۔ اس طرح کے معاملات میں ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل اور رواداری (Tolerance) ہو، خاص طور پر ہندستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ مدعی کی درخواست قابل لحاظ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عین قانون کے مطابق ہے۔ اس اظہار خیال کے ساتھ مدعی کی درخواست خارج کی جاتی ہے:

With these observations, the writ petition will stand dismissed.

مدراس ہائی کورٹ کا فیصلہ مکمل اور اصلی صورت میں الرسالہ انگریزی (دسمبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں اگر کچھ لوگ متعصب اور فرقہ پرست ہیں تو یہاں ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بے تعصب اور انصاف پسند ہیں۔ مزید یہ کہ یہ دوسرے لوگ اس حد تک طاقت ور ہیں کہ وہ پہلے گروہ کے ارادے کو عمل میں آنے سے روک دیں۔

اب اس واقعہ پر ایک اور انداز سے غور کیجئے۔ فرض کیجئے کہ مدراس کی مذکورہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر جب ہندوؤں نے اعتراض کیا تو وہاں کے مسلمان بگڑ جاتے۔ وہ اس کے مقابلہ میں جلسہ اور ایجی ٹیشن کی سیاست چلاتے۔ وہ ہندوؤں سے ٹکراؤ کرتے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ ہندوؤں کی ضد بڑھتی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ لڑائی چھڑ جاتی۔ اب وہی واقعات پیش آتے جو شمالی ہند میں اسی قسم کے مسائل پر پیش آتے رہتے ہیں۔ یعنی دونوں

فرقوں کے درمیان فساد ، اور پھر مسلمانوں کا یک طرفہ طور پر مارا جانا۔ اور ان سب کے باوجود اصل مسئلہ کا اپنی جگہ بدستور باقی رہنا۔

ہائی کورٹ کے جج امکانی طور پر منتظر تھے کہ مسلمان ان کی عدالت میں اپنے مقدمہ کی پیروی کریں اور وہ عین مسلمانوں کے حق میں قانونی فیصلہ دے دیں۔ مگر مسلمانوں کی غیر حکیمانہ روش کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ تمام جج گویا انتظار میں پڑے رہتے اور مسلمان غیر ضروری طور پر مارے جاتے۔ ان کی جائدادیں جلائی جاتیں۔ لاؤڈ اسپیکر کو بچانے کے نام پر پوری مسجد ویران کر دی جاتی۔ یہ امکان اپنی پوری موجودگی کے باوجود، مسلمانوں کے حق میں واقعہ نہ بن سکتا۔ اس دنیا میں کوئی امکان اپنے آپ کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔ یہاں ہر امکان کو استعمال کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی وہ کسی کے لئے واقعہ بنتا ہے۔

مدراس کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کامیابی کا عظیم امکان موجود ہے، مگر مسلمان اب تک اس امکان کو استعمال نہ کر سکے، اس لئے ان کے مسائل بھی اب تک حل نہیں ہوئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے موجودہ رہنماؤں نے مجرمانہ حد تک غفلت کا ثبوت دیا ہے۔

مسجد کے معاملہ کو عدالت کے ذریعہ طے کرنا گویا کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنا تھا۔ اس کے برعکس مسجد کا مسئلہ اگر عوامی مظاہرہ کا موضوع بنایا جاتا تو یہ کھیر کو ایسے برتن میں رکھنا ہوتا جو مسلمانوں کے لئے غیر موافق تھا۔ پہلی صورت میں کھیر پوری طرح مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔ جب کہ دوسری صورت میں کھیر تمام تر دوسرے کے حصہ میں چلی جاتی۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جس کو مسلمانوں کے موجودہ مسائل میں نمبر ایک درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اگرچہ ملک کے بٹوارہ کے پہلے سے موجود ہے۔ تاہم اپنی موجودہ صورت میں اس کا آغاز فروری ۱۹۸۶ میں ہوتا ہے جب کہ فیض آباد ڈسٹرکٹ جج کے حکم سے اس کا تالا کھول دیا گیا اور ہندوؤں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مسجد کے اندر اپنی مورتیاں رکھ دیں۔

اس کے بعد مسلمانوں (صحیح تر لفظوں میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں) نے کیا کیا۔ ان کے لئے یہی ایک

امکان موجود تھا جس کی ایک مثال مدراس ہائی کورٹ کے فیصلہ کی صورت میں اوپر بتائی گئی ہے۔ مگر مسلم لیڈروں نے اس امکان کو استعمال کرتے ہوئے عین اس کے برعکس عمل کیا۔ مارچ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس نے فوراً ہی ایجی ٹیشن کے انداز میں اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں جلسے کر کے جوشیلی تقریریں کی گئیں اور جلوس کے مظاہرے سڑکوں پر کئے جانے لگے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ مارچ ۱۹۸۷ میں تین لاکھ مسلمانوں کی ریلی دہلی میں نکالی گئی جس میں نعروں اور تقریروں کا ہنگامہ گرم کیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ اگست اور اکتوبر ۱۹۸۸ء میں لاکھوں مسلمان مارچ کرتے ہوئے اجودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد میں گھس کر جمعہ کی نماز پڑھیں گے۔ شور وغل کی اس سیاست سے بابری مسجد تو مسلمانوں کو نہیں ملی۔ البتہ فرقہ پرست ہندو جاگ اٹھے۔ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، گجرات وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔ اربوں روپے کی جائدادیں برباد کر دی گئیں۔

جس وقت یہ سب کچھ ہو رہا تھا، عین اسی وقت اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک انتہائی شاندار امکان مسلمانوں کے لئے اس ملک میں موجود تھا۔ مگر مسلم لیڈر اپنی ناقابل فہم بے خبری کی بنا پر نہ اس سے آگاہ ہوئے اور نہ اس امکان کو استعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ تدبیر کر سکے۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا تفصیلی تذکرہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں چھپ چکا ہے۔ یہ میٹنگ نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۷ مارچ ۱۹۸۸ کو ہوئی۔ اس کا مقصد بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے۔ مسلمانوں کی طرف سے جن لوگوں نے میٹنگ میں شرکت کی، ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہندو سائڈ میں مہنت اویدناتھ، صدر رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی، آچاریہ منی سوشیل کمار، جے ڈالمیا اور دوسرے بہت سے ذمہ دار حضرات شریک تھے۔

جب تمام لوگ بول چکے تو میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ ضروری پہلوؤں پر اظہار خیال کے بعد میں نے کہا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے سب سے زیادہ بہتر طریقہ ثالثی کا اصول ہے۔ اگر دونوں فریق ثالثی کے اصول کو مان لیں تو میری تجویز ہے کہ مسلّمہ تاریخ دانوں (تاریخ کے پروفیسروں) کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ اس بات کا پیشگی عہد کریں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ جو فیصلہ

[illegible]

کرے گا، اس کو وہ بلا بحث مان لیں گے اور فوراً اس کی تعمیل کریں گے۔

ہندو سائڈ کے تمام لوگ، بشمول مہنت اویدناتھ (موجودہ ایم پی) نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا۔ ہر ایک نے کہا کہ ہم اس تجویز کو مانتے ہیں۔ اس کو باقاعدہ صورت دی جائے اور اس کے مطابق بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی تضیہ کا فیصلہ کیا جائے۔ مگر مسلم سائڈ نے اس تجویز کو منظور نہیں ہونے دیا۔ سید شہاب الدین صاحب تقریباً چیخنے کے انداز میں بولنے لگے کہ ہم کو یہ تجویز منظور نہیں۔ مسلم سائڈ کے دوسرے تمام افراد نے خاموش رہ کر سید شہاب الدین کی بالواسطہ تائید کی۔ ان خاموش رہنے والوں میں جماعت اسلامی کے نمائندہ جناب افضل حسین صاحب (وفات یکم جنوری ۱۹۹۰) بھی شامل تھے۔ اس طرح ہندو سائڈ کی متفقہ تائید کے باوجود یہ میٹنگ شور وغل پر ختم ہوگئی۔

اب غور کیجئے کہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی اس تجویز کو اگر مسلم رہنماؤں نے مان لیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس کا اندازہ نہایت آسانی سے ان خطوط اور مضامین اور بیانات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو اس موضوع پر ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے برابر شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ۸۹ - ۱۹۸۷ کے درمیان اس قسم کی تحریریں کثرت سے شائع ہوئی ہیں جن کو عام مسلمان بھی قومی آواز، تعمیر حیات نقیب، دعوت، نئی دنیا، اخبار نو وغیرہ کی فائلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں میں صرف دو حوالوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دو حوالے بطور حصر نہیں ہیں بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ انھیں پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک بڑا تاریخی ادارہ ہے جس کو سنٹر فار ہسٹاریکل اسٹڈیز کہا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے ۲۴ پروفیسروں نے بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی مسئلہ کا مطالعہ خالص تاریخی انداز میں کیا اور اس پر ایک مفصل دستاویز تیار کی۔ یہ دستاویز ان کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع کی گئی۔ اس دستاویز کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (۶ نومبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دستاویز کا اردو ترجمہ قومی آواز (۱۶ جنوری ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔

اس تاریخی دستاویز پر جن لوگوں کے دستخط ہیں ان میں پروفیسر ایس گوپال، پروفیسر رومیلا تھاپر، پروفیسر بپن چندر جیسے ممتاز مورخین کے نام بھی شامل ہیں۔ اس مشترکہ تاریخی دستاویز میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بابری مسجد تو ایک تاریخی واقعہ ہے، مگر رام جنم بھومی کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ یہ ایک

فرضی کہانی ہے جو زیادہ تر والمیکی کی افسانوی نظم (رامائن) پر مبنی ہے۔ اس کا معلوم تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان تاریخی پروفیسروں کے پیش کئے ہوئے حقائق اتنے قطعی تھے کہ خود ہندوؤں میں بھی کوئی اس کو علمی طور پر رد نہ کر سکا۔ مثلاً مسٹر کے آر ملکانی (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۹۰) نے بالواسطہ طور پر اقرار کر لیا کہ رام جنم بھومی کا قصہ ابتدائی دور کا افسانہ (primitive myth) کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہ مذہبی معاملہ ہے، اس لئے اس کو پیشہ ور تاریخ دانوں کے ذریعہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت ممتاز دانشور ملک راج آنند (بمبئی) نے نہایت سخت تردیدی خط لکھا جو ٹائمس آف انڈیا (۵ فروری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔

دوسرا حوالہ جو میں اس سلسلہ میں دینا چاہتا ہوں، وہ ایک واقعہ ہے جو مختلف اخباروں، مثلاً اسٹیٹسمین (۶ جنوری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ بعض اردو اخباروں میں بھی اس کی روداد آئی ہے، مثلاً نئی دنیا (۲۷ جنوری ۱۹۹۰) اسٹیٹسمین کی رپورٹ کی نقل الگ صفحہ پر شائع کی جا رہی ہے۔

ہندستانی مورخوں کی ایک قدیم اور نہایت اہم تنظیم ہے جس کا نام انڈین ہسٹری کانگرس ہے۔ اس کے اجلاس ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۹ اس تاریخی انجمن کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ اس کے تحت ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ - یکم جنوری ۱۹۹۰ کو اس کا اجلاس گورکھپور میں ہوا۔ میزبانی کے فرائض گورکھپور یونیورسٹی نے انجام دئے۔ اس کانگرس میں ملک کے مختلف حصوں سے ۳۰۰ سے زیادہ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ یہ لوگ ملک بھر کی سو سے زیادہ یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۸۶ میں جب بابری مسجد - رام جنم (اجودھیا) کے مسئلہ نے شدت اختیار کی تو اس وقت انڈین ہسٹری کانگرس نے اپنے اجلاس (۱۹۸۶) میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن منظور کیا تھا۔ یہ رزولیوشن انڈین ہسٹری کانگرس کی رپورٹ ۱۹۸۶ (صفحہ ۱۸) میں چھپا ہوا موجود ہے۔ اس رزولیوشن میں اجلاس میں شریک ہونے والے تمام تاریخ دانوں نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ:

"انڈین ہسٹری کانگرس ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور انتشار پسندی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ اس رجحان کی ایک تشویشناک مثال کسی فرقہ کی صدیوں پرانی عبادت گاہوں کو اس

Indian History Congress

Walk-out over Ayodhya issue

The communal politics of Ramjanambhoomi-Babri Masjid controversy intruded rudely into the annual Indian History Congress being held at Gorakhpur University, earlier this week, leading to a walk-out by over 300 delegates, including the president of the Congress and leading historians.

On December 30, 1989 the Indian History Congress unanimously adopted a resolution reiterating its stand taken since 1986 that "monuments of ancient and medieval times should be rigorously brought under the protection of Ancient Monuments Act, and no structural change should be allowed, and that wherever religious worship had ceased, it should not be allowed to be re-started, whatever be the religious denomination involved."

Following this the Vice-Chancellor of Gorakhpur University, Professor Ms Pratima Asthana, who was also the local secretary of the Congress received a request from a member of Parliament from Gorakhpur, Mahant Avaidyanath of the Vishwa Hindu Parishad, that he would like the opportunity of addressing the Congress. When this request was put before the delegates, it was resisted and rejected as this was not on the agenda and the Indian History Congress was not the place for a political statement on a contentious issue.

However, Professor Asthana walked into the Congress followed by the Mahant and the majority of delegates including the president of the Congress walked out. Mahant Avaidyanath then addressed a few delegates, some employees of Gorakhpur University and some RSS workers, while the majority of the delegates held a meeting outside. Apparently slogans and counter slogans were raised and after Mahant Avaidyanath left the Congress continued its sessions.

Among those who walked out were Professor IrfanHabib of Aligarh Muslim University, Professor Barun De of the Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta. Professor Durga Prasad Bhattacharya of the Indian Statistical Institute, Calcutta, Proffessor A.Q. Rafeeq of Kashmir, Professor R. Champakalakshmi from Jawaharlal Nehru University and Professor Athar Ali, the President of the Congress.

Delegates expressed the view that even if all the Members of Parliament had done what Mahant Avaidyanath had done, the Congress would have reiterated its position. No request had been received from anyone to address the Congress while the agenda was being prepared for the annual Congress was a purely academic conference.

Historians resent the fact that an attempt was made by the Vishwa Hindu Parishad to use its forum for presenting a communal point of view and to create a disturbance at the Congress.

The Congress has nominated Professor H.L. Gupta, retired professor from Sagar University, as President of its next annual session.

The Statesman, New Delhi, January 6, 1990

بنیاد پر دوسرے فرقوں کی عبادت گاہوں میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے کہ ان کو ان مقامات پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں پہلے آخر الذکر فرقہ کی عبادت گاہیں تھیں۔ انڈین ہسٹری کانگرس کا خیال ہے کہ ماضی کی تخریبی کارروائیوں کی داستانوں کو دہرانا تاریخ کے نام کو ناپاک مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ اس تحریک کے رہنما جو شہادتیں پیش کرتے ہیں وہ اکثر مشکوک ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک آزاد ہندستان کی سیکولر اقدار کے منافی ہے۔ ہسٹری کانگرس تمام لوگوں سے، بالخصوص مورخوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سائنس اور سیکولرزم پر اس حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔" (خلاصہ)

گورکھپور کے اجلاس میں ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ کو اس سابقہ رزولیوشن کی نقلیں تمام شرکا ء کے درمیان تقسیم کی گئیں تاکہ موجودہ اجلاس میں دوبارہ اس کی توثیق کرائی جائے۔ اس کی خبر مہنت اویدناتھ کو ہوئی۔ وہ رام جنم بھومی تحریک کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے گورکھپور سے وشو ہندو پریشد کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے چناؤ (۲۲ نومبر ۱۹۸۹) میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔

مہنت اویدناتھ (ایم پی) کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی کی خاتون وائس چانسلر پرتیما استھانا کے پاس درخواست بھیجی کہ ان کو ہسٹری کانگرس کے اجلاس میں تقریر کرنے کی اجازت دی جائے۔ ہسٹری کانگریس کے مندوبین اس کے حق میں نہیں تھے۔ تاہم وائس چانسلر نے انھیں اجازت دے دی۔ مہنت اویدناتھ آر ایس ایس کے کچھ نوجوانوں کے ساتھ اجلاس میں آگئے۔ کانگرس کے مندوبین کو اس پر سخت اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے واک آؤٹ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین سو مندوبین میں سے صرف آٹھ آدمی اجلاس میں باقی رہے۔ مہنت اویدناتھ نے ایک ایسے ہال میں تقریر کی جہاں زیادہ تر خالی کرسیاں ان کو سننے کے لئے موجود تھیں۔

واک آؤٹ کرنے کے بعد مندوبین نے ہال کے باہر لان پر اپنی میٹنگ کی۔ اس میں مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسروں نے تقریریں کیں۔ انھوں نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ایک ایم پی تو درکنار، پارلیمنٹ کے تمام ممبران بھی ہم کو اس راہ سے نہیں ہٹا سکتے جس کو ہم تاریخی طور پر درست سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مہنت جی کا نام ایجنڈے میں شامل نہیں اس لئے انھیں ہسٹری کانگرس سے خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انھوں نے اس بات پر سخت غصہ کا اظہار کیا کہ فرقہ پرست

لوگ اپنے پروپیگنڈے کے لئے ہسٹری کانگریس کا پلیٹ فارم استعمال کر رہے ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد نے بھی کھل کر اس کی حمایت کی۔

اس معاملہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ بعد کو خود وائس چانسلر پرتیما استھانا نے کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور اگلے اجلاس میں مندوبین سے معافی مانگی۔

مہنت اویدناتھ جب خالی کرسیوں کو خطاب کر کے واپس چلے گئے تو مندوبین دوبارہ اسمبلی ہال میں واپس آئے اور ایک بار پھر انھوں نے اتفاق رائے سے وہ رزولیوشن منظور کیا جو دسمبر ۱۹۸۶ میں متفقہ طور پر منظور کیا جا چکا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کانگریس کے آٹھ مندوبین جو واک آؤٹ میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ بھی اس رزولیوشن کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکے۔ جب رزولیوشن پر رائے شماری کی گئی تو اجلاس کے ایک شخص نے بھی اس کی مخالفت میں اپنا ووٹ نہیں دیا۔

اوپر کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا دانشور اور مورخ طبقہ عام طور پر غیر فرقہ وارانہ انداز میں سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر سائنٹفک انداز سے رائے قائم کرتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی تجویز کو مسلم لیڈر نے منظور کر کے اس پر عملدرآمد کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ کس صورت میں نکلتا۔ یہ یقینی طور پر "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کے ہم معنی ہوتا۔ کیوں کہ تاریخ دانوں کا بورڈ اپنے علمی ذہن کی بنا پر تاریخی حقائق کی بنیاد پر فیصلہ کرتا۔ اور جب تاریخی حقائق کی بنیاد فیصلہ کیا جاتا تو وہ عین مسلمانوں کی موافقت میں ہوتا۔

یہاں مسلمانوں کے نادان لیڈروں نے ناقابل معافی ملی جرم کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ موقع تھا کہ اجودھیا مسئلہ کی "کھیر" کو اپنے موافق برتن میں رکھوائیں۔ مگر انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت اس کو اپنے غیر موافق برتن میں رکھ دیا۔ مورخین سے فیصلہ لینے کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ مسئلہ کو عوامی مظاہروں کا عنوان بنایا۔ وہ سڑکوں پر اس کا فیصلہ کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ کھیر کو اس برتن میں رکھنے کے ہم معنی تھا جو فریق ثانی کے لئے زیادہ موافق ہو۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ عین وہی تھا جو قانون قدرت کے تحت پیشگی طور پر اس کے لئے مقدر تھا۔ ایک فریق ساری کھیر کھا گیا، اور دوسرا فریق بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا، اور کچھ نہ کر سکا۔

نماز

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اور کفر کے درمیان ترک صلاۃ ہے۔ (بین الرجل والکفر ترك الصلاۃ) حضرت عمر نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ (الصلاۃ عماد الدین) نماز "اللہ اکبر" کے قول سے شروع ہوتی ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے قول پر ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: تحریمھا التکبیر وتحلیلھا التسلیم۔

نماز کی ابتدائی تیاری وضو سے شروع ہوتی ہے۔ وضو کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں جس کا وضو نہ ہو اور اس کا وضو نہیں جس نے اس پر اللہ کے نام کو یاد نہ کیا (لاصلاۃ لمن لا وضوء لہ ولا وضوء لمن لم یذکر اسم اللہ علیہ) وضو حقیقۃً ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ آدمی اپنے جسم کے کچھ نمائندہ حصوں کو دھو کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ اسی طرح تو اپنی رحمت کے پانی سے میرے پورے وجود کو پاک کر دے، تو میرا تزکیہ کر کے مجھے جنت میں داخل کر دے۔

مؤذن جب اذان کے کلمات کہتا ہے تو اس کے بارہ میں حکم ہے کہ تمام نمازی اس کو سن کر اسی طرح اپنی زبان سے دہرائیں۔ یہ دہرانا درحقیقت مؤذن کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس دینی عمل کے لیے پوری طرح تیار ہے جس کی طرف اس کو بلایا گیا ہے۔

اس کے بعد آدمی اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ پھر آدمی ادب سے کھڑا ہوتا ہے، وہ جھکتا ہے اور زمین پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ خدا بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں۔ میں آخری حد تک اس کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

آخر میں نمازی اپنے دائیں اور بائیں چہرہ پھیر کر کہتا ہے کہ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ اس طرح گویا وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر وہ عہد کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، ہر ایک کی جان اور مال اور آبرو، ہر چیز اس سے محفوظ اور مامون رہے۔

تخلیقی منصوبہ

انسان کے بارے میں خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ اسی سے دو اہم ترین سوال کا جواب متعین ہوتا ہے ——— انسان کی نجات کا دارومدار کس چیز پر ہے، اور یہ کہ دعوت اسلامی کا رخ کیا ہونا چاہیے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک اس معاملہ کو جاننے کے لیے قرآن میں کلیدی لفظ خلافت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں انسان خدا کا خلیفہ (نائب خدا) ہے۔ یہاں اس کو جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا قانون جو ساری دنیا میں تکوینی طور پر قائم ہے، اس کو وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے تشریعی طور پر انسانی زندگی میں جاری کر دے۔

یہ نظریہ قرآن کی آیت إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً سے نکالا گیا ہے۔ مگر یہ سراسر جسارت ہے۔ کیوں کہ قرآن کی اس آیت میں یا کسی اور آیت یا حدیث میں مذکورہ نظریہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ آیت میں "ایک خلیفہ" کا لفظ ہے نہ کہ "خدا کا خلیفہ" کا لفظ۔ خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین کے ہیں نہ کہ نائب کے۔ پھر "قانون شرعی کی تنفیذ" کا مذکورہ نظریہ بھی یکسر طبع زاد ہے۔ کیوں کہ آیت یا اس کے سیاق وسباق میں اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے، یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کا معاملہ ہے، اور قرآن کی بنیادی تعلیم کو لازمی طور پر "عبارۃ النص" سے نکلنا چاہیے، اتنی اہم بات کے لیے تعبیری استدلال ہرگز درست نہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہ انتہائی صراحت کے ساتھ وہاں لکھا ہوا ہمیں مل جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کی یہ آیت کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔

اس آیت کے مطابق، انسان کے بارہ میں خدا کے تخلیقی منصوبہ کو سمجھنے کے لیے کلیدی لفظ ابتلاء (آزمائش) ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو آزمائش کے لیے بسایا گیا ہے۔ ہر فرد کو مخصوص حالات کے اندر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر فرد کو انھیں حالات کے اندر حسن عمل کا ثبوت دینا ہے۔ جو شخص حسنِ عمل کے امتحان میں پورا اترے گا، اس کے لیے ابدی جنت ہے۔ اور جو شخص حسن عمل کے امتحان میں پورا نہ اترے اس کے لیے ابدی جہنم۔

شما حذر بکنید

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۹) میں قصۃ تحمل عبرۃ کے زیر عنوان ایک واقعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بہت بڑی نصیحت ہے اس کے لکھنے والے طائف کے ایک عرب استاذ ابراہیم ع ن ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مجھ کو مطالعہ کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ہر روز میں پانچ گھنٹہ سے زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ کوئی جریدہ یا مجلہ یا نئی کتاب میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ان کو حرف بہ حرف پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ مطالعہ میری روزانہ زندگی کا ایک لازمی جزء بن گیا۔ مگر آج میں بالکل اندھا ہوں۔ اب میں کوئی بھی چیز اپنی آنکھ سے نہیں پڑھ سکتا۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کی وجہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ بعض امور میں مفرط (حد سے تجاوز کرنے والے) بن گیے۔ چنانچہ وہ گاڑی بہت تیز دوڑاتے تھے۔ اور اسی کے نتیجہ میں یہ حادثہ پیش آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی گاڑی بہت زیادہ تیز دوڑا رہا تھا۔ انتہائی تیزی کی بنا پر میری گاڑی راستہ سے ہٹ گئی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک گئی اور سڑک کے کنارے ایک بھاری کھمبے سے جاکر ٹکرا گئی۔

میرے سر میں سخت چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد لمبے عرصہ تک میں اسپتال میں زیر علاج رہا۔ ڈاکٹروں کی زبردست کوشش اور جدید ترین طبی ذرائع کے استعمال کے باوجود میں دوبارہ اچھا نہ ہو سکا۔ اس کے نتیجہ میں میں نے اپنی آنکھ کھو دی۔ میں نے اپنی آنکھ کے علاج کے لیے ساری ممکن کوشش کر ڈالی۔ مگر میری بینائی واپس نہ آسکی۔ اب یہ حال ہے کہ میں بالکل اندھا ہو چکا ہوں۔ اب میں اپنے شوق مطالعہ کو پورا کرنے پر قادر نہیں جو چھوٹی عمر سے میری زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ اور آخر تک میری روزانہ زندگی کا جزء بنا رہا۔

یہ مضمون اس جملہ سے شروع ہوتا ہے کہ کوئی شخص نعمت کی قدر اس وقت تک نہیں پہچانتا جب تک وہ اسے کھو نہ دے (لا احد يدرك قيمة النعمة حتى يفقدها)

اور اس فقرہ پر ختم ہوتا ہے کہ میں یہاں اپنا قصہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ شاید وہ دوسروں کے لیے نصیحت ہو (واسوق حکایتی ھذا لعل فیھا العبرۃ للآخرین)

اس واقعہ میں جو سب سے بڑا سبق ہے، وہ یہ ہے کہ ——— اس دنیا میں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پورب کی طرف سفر کرنے کے لیے پچھم کی طرف سفر کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھنا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں جو شخص "چھوڑنے" کے لیے تیار نہ ہو وہ "پانے" کے بارہ میں اپنے حوصلوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

اگر آپ مطالعۂ کتاب کا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنی گاڑی کو ہلکی رفتار سے چلائیے تاکہ وہ حادثہ کی شکار نہ ہو۔ اگر آپ تعلیم و تجارت کے میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو جھگڑے کی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیے، ورنہ آپ کا تمام منصوبہ دوسروں سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں چور چور ہو جائے گا۔ اگر آپ صالح نظریات کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو حکمرانوں سے سیاسی نزاع نہ کیجئے، ورنہ اصل تعمیری کام تو نہ ہوگا۔ البتہ حکمرانوں کے خلاف جھوٹی لڑائی میں آپ کا سارا وقت اور آپ کا سارا اثاثہ برباد ہو جائے گا۔

اگر کوئی نادان آدمی خواہ مخواہ لڑ مرنے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے تو ایسے آدمی کو اس حکمت کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جس آدمی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دنیا کے مواقع کو استعمال کر کے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے گا، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کی اس حکمت کو آخری حد تک پکڑے اور کسی بھی حال میں اسے نہ چھوڑے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو آخر میں اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ آئے گا کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا قصوروار ٹھہرا کر ان کے خلاف احتجاج کرتا رہے، جب کہ وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اس کا احتجاج سننے کے لیے بھی موجود نہ ہو۔

ذہنی سفر

سید شفیع الدین صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ الرسالہ اردو، انگریزی دونوں کے مستقل قاری ہیں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حلقہ کے لوگوں نے جب الرسالہ کو پڑھنا شروع کیا تو یہ مطالعہ ان کے لیے ایک قسم کا ذہنی سفر بن گیا۔ اس سفر میں طرح طرح کے مراحل آئے۔ وہ مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے آخر کار مکمل اتفاق تک پہونچ گیے۔ سید شفیع الدین صاحب انگریزی کے شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے مذکورہ ذہنی سفر کو ایک نظم میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سفر کی یہ روداد صرف ایک خاص حلقہ کی نہیں بلکہ بہت سے قارئین الرسالہ کی روداد بھی ہے۔ ان کی یہ نظم نیچے نقل کی جاتی ہے اور مقابل کے صفحہ پر اس کا اردو ترجمہ درج ہے۔

Stages: Impact of 'Al-Risala'

I am furious and agitated
Restlessly coiling, I hiss and flash ...
You have struck hard
At my raised hood of false pride!
I am confused and disillusioned
At my own battered and vulnerable position ...
You have blown away
The smoky citadel and bastion of my misconceptions!
I am lost in an endless labyrinth —
Unlit and eerie,
Desperately searching the way out ...
You have unmasked the fangs of my guide!
Gradually ... very gradually
Almost unnoticed, unknowingly
step by step
Stage by stage
The down of TRUTH unveils itself.
My anger recedes,
My mind begins to clear
And I tread in the direction —
A ray of hope is filtering
Through rumbling dark clouds ...

Syed Shafiuddin, M.A. (Eng), M. Ed.
New Delhi, January 4, 1989

مراحل : الرسالہ کی تاثیر

میں غضب ناک ہوں اور مشتعل ہو رہا ہوں
بے چینی کے ساتھ بل کھاتا ہوں، میں پھنکارتا ہوں اور بھڑک اٹھتا ہوں
تم نے بڑی سخت ضرب لگائی ہے
میری جھوٹے فخر کی ابھری ہوئی کلاہ پر
میرا ذہن منتشر ہے، میں فریب سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہوں
اپنی مسمار شدہ اور کمزور حالت سے
تم نے اڑا دیا ہے
میرے دھواں آلود قلعہ اور میرے غلط تصورات کے برج کو
میں اپنی لامتناہی بھول بھلیاں میں کھو گیا ہوں
تاریک اور بھیانک
مایوسانہ طور پر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں
تم نے میرے رہنما کی کیس بے نقاب کر دی ہے
آہستہ آہستہ، بہت آہستہ آہستہ
تقریباً بے خبری میں، نہ جانتے ہوئے
رفتہ رفتہ
مرحلہ بہ مرحلہ
سچائی کی صبح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے
میرا غصہ جانے لگتا ہے
میرا ذہن صاف ہونا شروع ہوتا ہے
اور میں صحیح رخ پر چل پڑتا ہوں
امید کی ایک کرن پھوٹتی ہے
گرجتے ہوئے تاریک بادلوں سے

حقوق نہیں ذمہ داری

ایک مسلم لیڈر نے مسلمانان ہند کے مسئلہ کے بارہ میں اپنے طویل مضمون میں ایک بار لکھا تھا:
"گاندھی جی کے گجرات کے شہر ہمت نگر کے مسلمانوں کے ایک وفد کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ گزشتہ سال وہاں پہلی بار فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ ۲۵ دکانیں جلادی گئیں۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے وفد کے لیڈر نے اپنا بیان اس طرح شروع کیا: ہمارا سیاست سے کبھی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم نے کسی کا کچھ نقصان نہیں کیا ہے۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی بیداری اور عملی سیاست میں شامل ہوئے بغیر کوئی اقلیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی اس کو اس کا حق مل سکتا ہے۔ ہر چیز سیاست پر منحصر ہے۔ اگر آپ سیاست سے الگ رہیں گے تو کوئی آپ پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا۔ اگر آپ اپنی سیاست کسی ایک کے ساتھ وابستہ کردیں گے جب بھی آپ کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ سیاست امید وبیم کا ایک کھیل ہے۔ کسی پارٹی کو آپ کی حمایت سے محروم ہونے کا خطرہ اور کسی پارٹی کو آپ کی حمایت حاصل کرنے کی امید ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کو یہ جمہوری حق حاصل ہے۔ مسلمانوں کا کل اثاثہ یہی ہے۔ اور ان کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق کو کب اور کس طرح استعمال کرتے ہیں"

السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا ۹ - ۱۵ جنوری ۱۹۸۳

ہندستان کے مسلمان پچھلے سو سال سے سیاست ہی کے طریقہ پر چل کر اپنا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ الکشن میں، اپنے خیال کے مطابق، وہ کبھی کسی کو جتاتے ہیں اور کسی کو ہراتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے تمام قومی مسائل غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں جو لیڈر مذکورہ قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو اتنے بڑے نادان ہیں کہ انھیں حقائق کی کچھ خبر نہیں۔ یا اتنے بڑے شاطر ہیں کہ بس ایک سستا نعرہ لگا کر وہ اپنی قیادت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کا مسئلہ جمہوری حق کو استعمال کرنے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرکے موجودہ صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرکے ہی وہ دوبارہ اپنے لیے عزت کا مقام پا سکتے ہیں۔

۱۔ محمد طارق الکردی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب ہیں۔ وہ آئرلینڈ میں وہاں کے شہر ڈبلن (Dublin) میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہاں کی ایک یونیورسٹی میں اسلامی نمائش ہو رہی ہے۔ اس موقع پر وہ لوگ اسلامی مرکز کی تمام انگریزی کتابیں اور الرسالہ انگریزی بھی برائے نمائش اور فروخت رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں مرکز کی انگریزی مطبوعات طلب کی ہیں جو ان کو بھیج دی گئی ہیں۔

۲۔ انٹرنیشنل صوفی سنٹر (نئی دہلی) کے تحت ۳-۴ فروری ۱۹۹۰ کو ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس میں مختلف ملکوں اور مختلف مذہبوں کے ممتاز اسکالر شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر اسلام کے روحانی پہلو کے بارہ میں ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بعض اسباب سے وہ خود اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ اس موقع کے لیے ایک مقالہ تیار کر لیا گیا تھا جو سیمنار کے ذمہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا:

The Man Al-Islam Builds

۳۔ پیلی مزرعہ (ضلع انبالہ) میں مدرسہ بیت العلوم ۱۳۴۴ھ سے قائم ہے۔ اس کے ذمہ داروں کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے پیلی مزرعہ اور دوسرے قریبی مقامات کا سفر کیا۔ یہاں اجتماع اور ملاقاتوں میں دینی اور تعمیری موضوع پر خطابات ہوئے۔ یہ سفر ۳۰-۳۱ جنوری ۱۹۹۰ کو کیا گیا۔ ایک تقریر کا عنوان "اسلام میں علم کی اہمیت" تھا۔ دوسری تقریر کا عنوان "نماز کی اہمیت"۔

۴۔ بلجیم کے ایک نومسلم (Mady Van der Velden) نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں منگائی ہیں۔ انھوں نے اپنے خط ۱۸ جنوری ۱۹۹۰ میں اطلاع دی ہے کہ ان کتابوں کو خود پڑھنے کے علاوہ وہ اینٹورپ (Antwerp) میں اپنے دوستوں کو پڑھا رہے ہیں۔

۵۔ مختلف ملکوں کے جرائد میں الرسالہ کے مضامین نقل کیے جا رہے ہیں اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر دائرہ میں پھیل رہا ہے۔ انھیں میں سے ایک جنیوا کا انگریزی مجلہ (The Firmest Bond) ہے۔ وہ اکثر الرسالہ کی چیزیں نقل کرتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ نمبر ۴۵ (۱۹۸۹) میں ایک

انگریزی مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

The Message of the Hudaybiah Peace

۶۔ کمانڈر یوسف خاں صاحب اعلیٰ ٹریننگ کے پروگرام کے تحت امریکہ گئے۔ وہاں وہ چھ مہینہ (۱۹۸۹ کا نصف آخر) مقیم رہے۔ وہ اپنے ساتھ الرسالہ کے شمارے اور انگریزی کتابیں بھی لے گئے تھے۔ انھوں نے تقریباً ۲۵ مسلموں اور غیر مسلموں کو رسالے اور کتابیں دیں۔ اور لوگوں سے کہا کہ خود پڑھنے کے بعد وہ دوسروں کو پڑھنے کے لیے دیتے رہیں۔ پڑھنے والوں نے عام طور پر اس کو پسند کیا اور مزید مطالعہ کی خواہش ظاہر کی

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : میں پانچ سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ صحیح معنوں میں اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچانا اس جریدہ کا مقصد ہے۔ اسی میں دورِ جدید کے مسلمانوں کی اصلاح اور تعمیر مضمر ہے۔ میں نے الرسالہ کی دس کاپیوں کی ایجنسی لی ہے اس کے علاوہ ہر ماہ تقریباً پچاس آدمیوں کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ بڑی حد تک کامیابی ملی ہے اس ملک میں شیلا پوجن کو لے کر کچھ جگہوں پر فساد ہوئے۔ لیکن جس قدر بڑے پیمانہ پر فساد کا اندازہ تھا اس سے بہت کم فسادات ہوئے۔ اس کی خاص وجہ اعراض اور صبر کا عمل ہے جو مسلمانوں نے قائم کیا۔ یہ صرف الرسالہ کی دین تھی۔ میں نے آپ کی تقریباً تمام کتابیں منگوائی ہیں اور کالجوں میں سپلائی کی ہے۔ انشاء اللہ مزید کالجوں میں سپلائی کروں گا۔

(محمد اشفاق صدری، بستی پور)

۸۔ ایک صاحب نے بتایا کہ انھیں کچھ چھپے ہوئے ہینڈ بل ملے جن میں الرسالہ مشن پر سب وشتم کیا گیا تھا۔ ان میں عبدالبصیر (مٹیا محل، دہلی) اور اظہار الحق خاں (چتلی قبر، دہلی) کے نام درج تھے۔ انھوں نے دہلی کے دونوں مقامات پر تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ وہاں اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں جس نے اس قسم کا مضمون تحریر کیا ہو۔ اس مخالفانہ ہینڈ بل اور مضمون کو کچھ رسالے اور اخبارات مزید نقل کر رہے ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر مقالے شائع کر رہے ہیں۔ جو لوگ اس طرح فرضی ناموں سے مضمون لکھیں وہ بلاشبہ بزدل ہیں اور جو لوگ ان کو بلا تحقیق چھاپیں پھیلائیں وہ بلاشبہ شر پسند ہیں۔ بزدلی اور شر پسندی کے تحت جو مہم چلائی جائے اس کے ا

کے بارہ میں رائے قائم کرنا کچھ مشکل نہیں۔

۹۔ ایک صاحب ہالینڈ سے لکھتے ہیں : آپ کے الرسالہ کی ایک کاپی ۱۹۸۳ کسی سے ہم کو پڑھنے کے لیے ملی۔ ماشاء اللہ بہت ہی اچھا رسالہ ہے اور کافی علم کی باتیں معلوم ہوئیں۔ مولانا صاحب، یہاں یورپ میں اسلامی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ آپ ہر ماہ میرے نام الرسالہ بھیجیں اور جو کتابیں آپ کی ہیں وہ بھی سب بھیجیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ایک بار ہالینڈ ضرور ضرور آئیے (محمد سلطان خان، ڈین ہاگ، ہالینڈ)

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : میں قریب دو سال سے آپ کا الرسالہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ بیان سے باہر ہے کہ آپ کس قدر اس سوئی ہوئی قوم کو اپنے حقیقت پسند مضامین کے ذریعہ جگانا چاہتے ہیں۔ کاش یہ قوم پڑھ کر سمجھے۔ (شمشاد علی خاں ایڈوکیٹ، سہارن پور)

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : ہر دلعزیز الرسالہ اس وقت پورے ہندستان میں ایک انقلاب پیدا کیے ہوئے ہے۔ ایک زمانہ میں جس طرح الہلال نے لوگوں کو جھنجھوڑا تھا اسی طرح اس زمانہ میں الرسالہ وہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ منفی پہلو سے تھا اور یہ مثبت پہلو کو لیے ہوئے ہے۔ (مبین اسحق قاسمی، خطیب مسجد ایف سیکٹر، بمبئی)

۱۲۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : کئی ماہ سے الرسالہ کا مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ الرسالہ کے ذریعہ اس بگڑی ہوئی قوم کی ذہنی تعمیر کا بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں بہت سے اخبارات اور میگزین کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ مگر دوسرے اخبارات و رسائل نے غیر مسلموں کے خلاف زہر افشانی کر کے ذہن کو بالکل بگاڑ دیا تھا۔ میرے اندر ہمیشہ غیر مسلموں کے خلاف ایک قسم کا ٹنشن رہتا تھا۔ مگر جب سے میں نے الرسالہ کا مطالعہ شروع کیا اللہ کے فضل سے نفرت شفقت میں تبدیل ہو گئی ہے (اعجاز احمد وسیم، سیوان)

۱۳۔ اقوالِ حکمت نام کی کتاب چھپ چکی ہے۔ اس میں زندگی کی تعمیر سے متعلق اقوال درج کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام انوارِ حکمت ہوگا۔ اس دوسری کتاب میں دینی اور روحانی قسم کے اقوال درج ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرِ تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے ناٹس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر [illegible] نئی دہلی سے شائع کیا